جلد ٦١
عدد ٥

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

جولائی ١٩٦٣ء

اسلام کے نظامِ سیاسی پر معرکہ آرا تصانیف

اسلامی ریاست

— از: مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی —

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر۔
- علماء وطلباءِ قانون وسیاست کے لیے ایک خزینۂ علم

قیمت قسم اعلیٰ بارہ روپے سستا ایڈیشن آٹھ روپے

الجہاد فی الاسلام

— از: مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی —

- اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلّل و مستند کتاب
- اسلامی قوانینِ جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانین جنگ سے موازنہ
- اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

قیمت قسم اعلیٰ ۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۵۰، ۰ روپے

سُنّت کی آئینی حیثیّت

— از: مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی —

- سُنّت کیا ہے؟
- سُنّتِ نبوی کا دین میں صحیح مقام کیا ہے؟
- سنّتِ نبوی کی صحت وحفاظت کا ثبوت
- منکرینِ حدیث وسُنّت کا مسکت و مدلّل جواب

آفسٹ کی حسین کتابت وطباعت قیمت ۸/۵۰ روپے

نظامِ اسلامی — مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

— مرتبہ: مولانا خلیل حامدی صاحب —

- مراکش سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام کے ممتاز رہنماؤں کی نگارشات کا مجموعہ۔
- ملّتِ اسلامیہ کے جسدِ خوابیدہ کو دعوتِ انقلاب وعمل
- معاندینِ اسلام کا بھرپور اور مدلّل جواب۔

۵۰۰ صفحات سے زائد۔ قیمت صرف ۶/۵۰ روپے

تحریکِ آزادیٔ ہند اور مُسلمان

— از: مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی —

- قبل تقسیم مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی اور تمدّنی حالت کا نقشہ۔
- مسلمانانِ ہند کیلیے صحیح نصب العین اور طریقۂ کار کی نشاندہی۔
- برصغیر ہند و پاک کی پچاس سالہ ہنگامہ خیز سیاست پر بے لاگ تبصرہ

حسین کتابت وطباعت۔ رنگین ڈسٹ کور۔ قیمت صرف -/۱۰ روپے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

— از مولانا سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی —

- اسلامی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں؟
- اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق اور موازنہ
- اسلامی تہذیب کی برتری پر مدلّل تفصیلی بحث

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/۲۵ روپے

〃 سستا 〃 ۳/۰۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ – شاہ عالم مارکٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۱	جولائی ۱۹۶۴ء	عدد ۵

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵-اے - ذیلدار پارک - اچھرہ ، لاہور - پاکستان

سالانہ چندہ : سات روپے ———— قیمت فی پرچہ : ۷۵ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

چھ ماہ کی بندش کے بعد آج ترجمان القرآن پھر شائع ہو رہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

ترجمان القرآن پر جو افتاد پڑی ہے اس کا اجمالی علم تو بیشتر قارئین کو ہو چکا ہوگا، تاہم صحیح صورتِ حال کی تفصیلات سے کم حضرات آگاہ ہوں گے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضروری واقعات یہاں بالاختصار پیش کر دیئے جائیں۔

ترجمان اکتوبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں ایک مضمون "ایران میں دین اور لادینی کی کشمکش" کے زیر عنوان چھاپا گیا تھا۔ اس پر مغربی پاکستان کے شعبۂ اطلاعات کی جانب سے ایک مراسلہ مورخہ ۱۲ نومبر ۶۳ء ناشر ترجمان کو وصول ہوا جس میں تحریر تھا کہ مذکورہ بالا مضمون سے حکومت پاکستان اور حکومتِ ایران کے مابین دوستانہ روابط خراب ہونے کا امکان ہے، اس لیے آپ سات دن کے اندر وجہ بتائیں کہ ویسٹ پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی ننس ۱۹۶۳ء کے تحت آپ کے خلاف کیوں کارروائی نہ کی جائے، آپ کے رسالے کا ڈیکلریشن معطل کیوں نہ کیا جائے اور آپ سے دس ہزار روپے کی ضمانت کیوں نہ لی جائے۔ اگر آپ بالمشافہ صفائی پیش کرنا چاہیں تو شعبہ مذکورہ کے ڈپٹی سکریٹری صاحب سے ۱۹ نومبر کو ملاقات بھی کر سکتے ہیں۔

اس نوٹس کے جواب میں ۱۸ نومبر کو حسبِ ذیل توضیحات سیکرٹری صاحب کی خدمت میں تحریراً پیش کی گئیں:

۱- ہمارے اکتوبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں "دین اور لادینی کی کشمکش" کے زیر عنوان

جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں کوئی چیز مقالہ نگار نے اپنی طرف سے نہیں لکھی ہے بلکہ وہ ایران اور عراق کے معروف اہلِ علم کی شائع شدہ تحریروں کا خلاصہ ہے۔ اور وہ شائع شدہ مواد ہمارے پاس موجود ہے۔ علاوہ بریں جن واقعات کا اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ دنیا کی خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ سے بھی پاکستان کے اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو نوائے وقت لاہور، ۲۵، جنوری ۶۳ء، و ۶ جون ۶۳ء۔

۲۔ اس مضمون کے جواب میں سفارت خانہ ایران کی طرف سے ایک مضمون ہمارے پاس آچکا ہے جسے ہم لفظ بلفظ زیرِ طبع پرچے میں دے رہے ہیں۔ یہ پرچہ یکم دسمبر ۶۳ء کو شائع ہونے والا ہے۔ کوئی پرچہ اگر تصویر کے دونوں رُخ بے کم و کاست لوگوں کے سامنے رکھ دے تو اس کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے بدنیتی کے ساتھ کام کیا ہے۔ یا اس کے پیشِ نظر کوئی خرابی برپا کرنا ہے۔ بلکہ یہ فعل دنیا کے معروف آدابِ صحافت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔

۳۔ مغربی پاکستان کے متعدد اخبارات و رسائل میں متعدد دوست ملکوں اور ان کی حکومتوں کے حالات پر بحث و تنقید کی جاتی رہی ہے۔ ان پر کوئی کارروائی نہ ہونے سے ہم یہ تصور کرنے میں حق بجانب تھے کہ ویسٹ پاکستان پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی نینس کا منشا یہ نہیں ہے کہ دوست ممالک کے اچھے یا بُرے حالات کو شائع کرنا یا ان پر تبصرہ کرنا سرے سے ہی جرم ہے۔ نیز یہ تصور کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے کہ قانون کا اطلاق سب اخبارات و رسائل پر یکساں نہ ہوگا، یا دوست ممالک کے درمیان فرق کیا جائے گا۔

۴۔ ترجمان القرآن کے متعلق اس طرح کی شکایت پہلی مرتبہ ہی ہوئی ہے۔ اس صورت میں آرڈی نینس کی دفعہ ۲۷ کے تحت تنبیہ پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔"

دسمبر کے پرچے میں سفارت خانہ ایران کی جانب سے موصولہ مضمون شائع کر دیا گیا۔ اس کے بعد حکومت مغربی پاکستان کے ہوم سیکرٹری صاحب کی طرف سے ایک حکم نامہ مورخہ ۱ جنوری ۱۹۶۴ء موصول ہوا جس میں یہ درج تھا کہ ترجمان کے مضمون "ایران میں دین

اور لادینی کی کشمکش" سے چونکہ حکومت پاکستان اور حکومت ایران کے تعلقات بگڑ جانے کا امکان ہے اور نوٹس کے جواب میں اس کے ناشر کی جانب سے پیش کردہ توضیح غیر تسلی بخش ہے، اس لیے گورنر صاحب مغربی پاکستان آرڈی نینس مذکورہ کی دفعہ ۲۷ کے تحت ترجمان القرآن کے ڈیکلریشن کو چھ ماہ کے لیے معطل فرماتے ہیں۔

اس کارروائی کے بعد ۱۲ فروری ۱۹۶۴ء کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ میں ناشر ترجمان القرآن کی جانب سے ایک درخواست داخل کی گئی جس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ جس آرڈی نینس کے تحت ترجمان کے خلاف کارروائی کی گئی ہے وہ ۱۰ اکتوبر ۶۳ء کو نافذ ہوا ہے اور ترجمان کے جس مضمون پر اعتراض کیا گیا ہے وہ ۲ اکتوبر ۶۳ء کو پریس میں چھپ گیا تھا اور ۵ اکتوبر کو اس کی بڑی تعداد قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی، اس لیے اس کی اشاعت آرڈی نینس مذکور کی زد میں نہیں آتی۔ اس درخواست میں یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ بیرونی ممالک سے تعلقات کی خرابی کا مسئلہ مرکزی حکومت کے حیطۂ اختیار میں ہے، اس لیے صوبائی حکومت اس ضمن میں کوئی قانون سازی یا انتظامی اقدام نہیں کر سکتی۔ آرڈی نینس مذکور کو اس بنا پر بھی چیلنج کیا گیا تھا کہ یہ دستور کے بنیادی حقوق سے متصادم ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر استدعا کی گئی تھی کہ پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈی نینس کو بنیادی حقوق کے منافی اور کالعدم قرار دیا جائے اور ترجمان القرآن کی معطلی کا حکم بھی غیر قانونی ٹھہرایا جائے۔

اس درخواست پر عدالت عالیہ نے جلد تاریخ مقرر کرنے کا حکم صادر فرمایا لیکن تقریباً تین ماہ تک کوئی تاریخ متعین نہ ہو سکی۔ اس کے بعد مزید ایک درخواست اس امر کی پیش کی گئی کہ اس مقدمے کی سماعت کے لیے تاریخ کا تعین فرمایا جائے، ورنہ دادرسی کا مقصد فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس پر معزز عدالت نے دوبارہ حکم دیا کہ بہت جلد تاریخ مقرر کی جائے۔ لیکن تاریخ مقرر ہونے سے پہلے پابندی کی میعاد ختم ہو چکی ہے اور یہ پرچہ بندش کی پوری مدت ختم ہو جانے کے بعد اسی وقت پر شائع ہو رہا ہے جس وقت پر یہ عدالت سے رجوع نہ کرنے

کی صورت میں شائع ہوتا۔

قارئین ترجمان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ترجمان القرآن کی اشاعت پر پابندی کے پانچ روز بعد مدیر ترجمان القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی جماعت کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان سمیت نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اس نظر بندی کے جو وجوہ مولانا کو جیل میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے بتائے گئے تھے ان میں اس مضمون کی اشاعت کا ذکر کیا گیا تھا جس کی بنا پر ترجمان کو بند کیا گیا تھا۔ اس کا جو جواب مدیر ترجمان القرآن کی جانب سے ہوم سیکرٹری صاحب کو دیا گیا تھا، اس کا متعلقہ حصہ نقل کر دینا مناسب ہوگا، اور وہ یہ ہے:

"آخری الزام آپ کا میرے اوپر یہ ہے کہ میں نے اپنے رسالے ترجمان القرآن کے اکتوبر ۱۹۶۳ء کے پرچے میں ایک مضمون ایران اور اس کے شاہی خاندان کے خلاف شائع کیا تھا۔ اور آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس مضمون کی اشاعت سے میرا مقصد ایران کے ساتھ، جو پاکستان کا روایتی حلیف ہے، پاکستان کے تعلقات کو خراب کرنا تھا۔ اس کے جواب میں چند باتیں گذارش کروں گا۔

اولاً، جس مضمون کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ ایران اور عراق کے مشہور علماء کی شائع شدہ تحریروں کا قریب قریب لفظی خلاصہ تھا۔ ان میں سے ایک علماء ایران کا ایک مفصل خط ہے جس میں انہوں نے عراق کے سب سے بڑے شیعہ عالم السید ابوالقاسم الخوئی کو خطاب کر کے ایران کے حالات بیان کیے ہیں۔ اور یہ خط "رسالۃ من علماء ایران" کے نام سے نجف اشرف کے النعمان پریس نے شائع کیا ہے۔ دوسرا پمفلٹ خود سید ابوالقاسم الخوئی کا اپنا لکھا ہوا ہے جس میں انہوں نے ایران کے اندر یہودیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کی تفصیل بیان کی ہے اور اس کے خطرناک نتائج پر حکومتِ ایران کو متنبہ کیا ہے۔ یہ پمفلٹ بھی نجف اشرف سے بعنوان "تصریحات خطیرۃ للامام الخوئی" شائع ہوا ہے۔ تیسرا مفصل پمفلٹ "کفاح العلماء الاسلام" کے عنوان سے کربلا کی مجلس ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا ہے جس میں ایران کے واقعات کی پوری تفصیل تاریخ وار بیان کی گئی ہے۔

ثانیاً، اس مضمون کی اشاعت کے بعد میرے پاس سفارت خانہ ایران کی طرف سے ایک

تردیدی مضمون آیا اور مَیں نے اسے بھی دسمبر ۶۳ء کے پرچے میں شائع کر دیا۔ (اس رسالے کی ایک کاپی میں بورڈ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور خصوصیت کے ساتھ اس مضمون پر اڈیٹر کی طرف سے جو تعارفی نوٹ دیا گیا ہے اس کی طرف توجہ دلاتا ہوں)۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی رسالہ یا اخبار پوری ایمانداری کے ساتھ دونوں طرف کے بیانات شائع کر دے تو دنیا بھر کے مانے ہوئے اصولِ صحافت کے لحاظ سے اس کی روش پر آخر کیا اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

ثالثاً، پاکستان کے اخبارات و رسائل سے مَیں کم و بیش ۵۰ ایسی مثالیں پیش کر سکتا ہوں جن میں ٹرکی، مصر، شام، اردن، سعودی عرب، عراق، کویت اور دوسرے متعدد ملکوں کے متعلق اور ان میں سے بعض کے حکمرانوں کی شخصی زندگیوں کے متعلق اس سے بھی زیادہ سخت مضامین شائع ہوئے ہیں۔ میرے لیے اس وقت جیل میں ان مثالوں کو فراہم کرنا مشکل ہے، لیکن اگر مجھے موقع دیا جائے تو مَیں اصل پرچوں کی کاپیاں پیش کر سکتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ آیا صرف ایران ہی پاکستان کا دوست ملک ہے یا دوسرے ملک بھی ہیں؟ اور اگر یہ دوسرے ملک بھی پاکستان کے دوست ہیں تو ان کے متعلق جو مضامین لکھے گئے تھے ان پر گرفت نہ کرنے اور ترجمان القرآن پر گرفت کرنے کی کیا معقول وجہ ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ ترجمان القرآن کو اس جرم کی پاداش میں بند کرنے کے بعد ترازو کے پلڑے برابر کرنے کے لیے لائلپور کے ایک اخبار المنبر کو بھی مصر کے خلاف لکھنے کی سزا دی گئی ہے۔ لیکن اس طرح کے مضامین صرف "المنبر" ہی میں نہیں نکلے ہیں۔ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ مَیں دوسرے متعدد اخبارات و رسائل کے کم و بیش ۵۰ ایسے ہی مضامین پیش کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ پھر کیا محض ایک اخبار کے خلاف کارروائی کرنے سے ترازو کے پلڑے برابر ہو جاتے ہیں؟

رابعاً، اس مضمون کی اشاعت کی یہ سزا ترجمان القرآن کو دی جا چکی ہے کہ اسے چھ مہینے کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ اب اسی فعل کی سزا مجھے گرفتار اور قید کرنے کی صورت میں دینا انصاف ہے یا جذبۂ انتقام کا اظہار؟

خامساً ترجمان القرآن کے مضمون کی اشاعت کی ذمہ داری تنہا مجھ پر ہے۔ مَیں شخصی حیثیت

سے اس رسالے کا مالک ہوں۔ جماعت اسلامی کی تشکیل سے بھی پہلے ۹ سال سے مَیں اس کو شائع کر رہا تھا۔ اس کے انتظام، ادارت، آمد و خرچ کا کوئی تعلق جماعت اسلامی سے نہیں ہے۔ اور نہ وہ جماعت اسلامی کا کسی معنی میں بھی آرگن ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس پرچے میں ایک مضمون شائع ہونے کی ذمہ داری پوری جماعت پر عائد کر دینا اور اس کو خلاف قانون قرار دینے کے علاوہ اس کے پچاس سے زیادہ لیڈروں کو بھی اس گناہ کی پاداش میں قید کر دینا کیا اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ حکومت دراصل جماعت اسلامی کے خلاف خار کھائے بیٹھی تھی اور ہر طرح کے کردہ وناکردہ جرائم کا الزام اس پر تھوپ دینے کے لیے تلی ہوئی تھی۔

سادساً، آپ کو آخر میری اس نیت کا علم کیسے ہوا کہ میں نے وہ مضمون پاکستان اور ایران کے تعلقات خراب کرنے کے لیے شائع کیا تھا؟ دنیا بھر میں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی حکومت اپنے ملک کے باشندوں پر زیادتی کرتی ہے اور خود ملک کے باشندے اس کی دراز دستیوں کو روکنے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو بیرونی ممالک کی رائے عام کا دباؤ اس پر ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے شہریوں کے ساتھ انصاف کرنے کی ضرورت محسوس کرے۔ ایران کے باشندے ہمارے مسلمان بھائی ہیں۔ اور ہمیں فطری طور پر ان سے ہمدردی ہے۔ میرے علم میں جب ایران اور عراق کے مستند علماء کی تحریروں سے یہ بات آئی کہ وہاں یہ ظلم ہو رہا ہے تو مَیں نے اس نیت سے ان کی تحریروں کا خلاصہ شائع کیا کہ ایران کی حکومت پر انصاف کرنے کے لیے اخلاقی اثر ڈالا جا سکے (اسی غرض سے ایران کے ایک دوسرے ہمسایہ ملک عراق کے بھی با اثر لوگوں نے وہ مضامین اور مفلٹ شائع کیے ہیں جن کا مَیں نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ درحقیقت میرے حاشیۂ خیال میں بھی اس مقصد کا کوئی شائبہ نہ تھا کہ مَیں اس ذریعہ سے پاکستان اور ایران کے تعلقات خراب کروں۔ لیکن حکومت نے مجھے مجرم ٹھیرانے کے لیے میرے اس فعل کو اپنی طرف سے بدترین معنی پہنا ڈالے اور میرے ساتھ پوری جماعت اسلامی پر یہ الزام عائد کر دیا (جیسا کہ اس کے ۶ جنوری کے پریس نوٹ سے واضح ہے) کہ وہ بھی اس برے مقصد کی حامل ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حکومت ہر ممکن الزام

ہم پر چسپاں کرنے کے لیے کس قدر بے چین ہے؟"

مدیر ترجمان کو جن وجوہ کی بنا پر بار بار حوالۂ زنداں کیا جا چکا ہے، وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ دستِ ظلم دراز کرنے والے، اسے سننے والے، اس ملک کے عوام اور بیرونی دنیا کا ایک معتد بہ طبقہ اس دلفگار داستان کی ایک ایک کڑی سے پوری طرح واقف ہے اور اُن اسباب پر بھی اچھی طرح نظر رکھتا ہے جس کے نتیجہ میں یہ سب کچھ ظہور میں آ رہا ہے اور آئندہ جس کے آنے کی توقع ہے۔ ان حالات میں ہم منعمِ حقیقی کی بارگاہ میں سراپا سپاس ہیں کہ اس نے ہم جیسے کمزور اور ناتواں افراد کو جن کے پاس علم و عمل کی کوئی پونجی نہیں ایک ایسی آواز بلند کرنے کی توفیق عطا فرمائی جو مختلف ادوار میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام نے بلند کی تھی اور جسے خاتم المرسلین کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد امت کے ائمہ اور صلحاء نے بڑی دلسوزی اور جرأت مندی کے ساتھ ہر عہد میں بلند کیا تھا۔ ہماری آواز اگرچہ نحیف ہے لیکن ہمارا دل اس بات پر پوری طرح مطمئن ہے کہ یہ آواز بہر حال وہی ہے جس کے بلند ہونے کے ساتھ ہی ظلم و استبداد کے ایوانوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ جہالت، تنگ نظری، تعصب، خود غرضی کی قوتیں بوکھلا اٹھتی ہیں، اور وہ سب مل کر اسے دبانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس قسم کے نامساعد حالات میں جب ملک کے پورے ذرائع و وسائل ایک نہایت ہی مختصر طبقہ کے ہاتھ میں ہوں اور وہ اقتدار کے نشے میں اس حد تک بہک چکا ہو کہ کسی معقول سے معقول بات کے سننے سے بھی اُسے ضد اور چڑ پیدا ہوتی ہو، انسان سوائے کارسازِ مطلق کے اور کس ذات پر بھروسہ کر سکتا ہے؟ بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ نَضِلَّ اَوْ نُضَلَّ اَوْ نَظْلِمَ اَوْ نُظْلَمَ اَوْ نَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیْنَا۔

ترجمان اور مدیر ترجمان کے ساتھ اس سلوک پر ہم کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے البتہ

ہم اتنی بات عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ جو کچھ ہوا ہے وہ عین توقع کے مطابق ہوا ہے۔ جب ملک کے سیاسی افق پر تاریک گھٹائیں چھا جائیں تو ان کے دامن سے بجلیوں کا گرنا کوئی غیر متوقع عمل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے سوا اگر کوئی دوسری صورت پیدا ہو جائے تو البتہ تعجب کا موجب ہو سکتی ہے۔ ترجمان القرآن جس نصب العین کی طرف مسلمانوں کو بڑھنے کی دعوت دے رہا ہے یہ سب اس راہ کے سنگِ میل ہیں جن سے آخری منزل کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اَن ہونی نہیں۔

یہاں ہم پھر ایک بار پوری صفائی کے ساتھ اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ترجمان القرآن کوئی تجارتی پرچہ نہیں جس کی پالیسی مادی نفع و نقصان کے میزانیوں کے مطابق متعین ہوتی ہو ہمارے نزدیک مالی سود و زیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہمارے لیے فیصلہ کن چیز صرف ایک ہے کہ کسی طرزِ فکر اور کسی طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں ہم اپنے خالق و مالک کی کس حد تک رضا جوئی حاصل کر رہے ہیں۔ اپنے آقا و مولا کی خوشنودی ہمارا منتہائے مقصود ہے۔ اگر ہمارے کسی کام سے ہمارا فرمانروائے حقیقی ہم سے خوش ہوتا ہے تو ہمیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ غرض کے بندے اُسے کس نگاہ سے دیکھتے ہیں، یا اقتدار کی جبینوں پر کس انداز کے شکن پڑتے ہیں۔ ہمیں اگر فکر ہے تو خالق کی برہمی کی۔ کیونکہ اس کی برہمی ہمارے لیے دنیا اور آخرت میں بربادی اور نامرادی کا حکم رکھتی ہے۔ اُس کی نگاہِ التفات ہٹ جانے کے بعد ہماری قسمت میں سوائے محرومی کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

باقی رہا دنیاوی اقتدار کا غیظ و غضب تو اُس کی ہمیں قطعاً کوئی پروا نہیں۔ ہم ہر قسم کی آزمائش کے لیے مالکِ حقیقی سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے دعوت نہیں دیتے لیکن اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ دنیا میں سب سے کمزور اگر کوئی چیز ہے تو وہ اقتدار ہے۔ بیتِ عنکبوت بھی اپنی کوئی بنیاد رکھتا ہے لیکن اقتدار کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔

پھر تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اقتدار کو سمیٹنے اور اسے اپنے حق میں محفوظ کرنے کے لیے جتنی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اتنے ہی اس میں زیادہ رخنے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ رجحان بالکل غیر فطری ہے اور اس بنا پر جب ایک فرد یا گروہ اس کی تسکین کے لیے غیر معمولی حربے استعمال کرتا ہے تو وہ بعض ایسی حرکات کا مرتکب ہو جاتا ہے جس سے اقتدار کی پوری عمارت ہل جاتی ہے۔ دُور نہ جائیے، آپ ماضیٔ قریب کے آمروں، ہٹلر، مسولینی اور سٹالن کے واقعات پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو اس قسم کے رجحانات کے تلخ نتائج کا پوری طرح اندازہ ہو جائے گا۔

اقتدار کو ایک ہاتھ یا چند ہاتھوں میں سمیٹنے اور اُس پر بلا شرکت غیرے قابض رہنے کی امنگ بذاتِ خود کسی صحت مند طرزِ فکر کی آئینہ دار نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی فرد یا گروہ لوگوں کے فطری حقوق اُن سے چھین کر خود انہیں اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس امنگ کی تسکین کے لیے برسرِ اقتدار طبقہ سب سے پہلے عوام کی زبانوں پر پہرے بٹھاتا ہے تاکہ وہ اس ظلم و زیادتی کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھا سکیں۔ جبر و تشدد کے خوف سے لوگ خواہ کتنے ہی خاموش رہیں لیکن زبان بندی کے یہ ظالمانہ ہتھکنڈے اُن کے احساسات و جذبات کو تو اُن سے سلب نہیں کر سکتے، اُن کے دل میں ہر وقت یہ چبھتا ہوا احساس موجود رہتا ہے کہ انہیں اپنی ایک بنیادی حق سے محروم کیا گیا ہے۔ ایک ظالم فرمانروا اگر کسی غریب کی جھونپڑی کو قوت کے نشے میں مسمار کروا کے اُس سے اپنے محلات کی حدود کو وسیع کرتا ہے تو وہ غریب اگرچہ زبان سے کوئی احتجاج نہیں کر سکتا لیکن اُس کا دل ہمیشہ نالہ و فریاد کرتا ہے کہ اس فرمانروا نے محض طاقت کے ذریعے سے اُسے اس کے ایک بنیادی حق سے محروم کر دیا ہے۔ اُس شخص کے دل میں اس احساس کا پرورش پانا بادشاہ کے اقتدار کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اقتدار کی قوت کا انحصار تیر و تفنگ اور لشکر و سپاہ پر نہیں ہوتا بلکہ عوام کی دلی تائید و حمایت پر ہوتا ہے جب

لوگ حکمرانوں کی طرف سے بددل ہونے لگیں۔ اور جنہیں وہ اپنے حقوق کا محافظ اور پاسبان سمجھتے ہوں اُن پر سے اُن کا اعتماد متزلزل ہونے لگے اور وہ انہیں اپنے حقوق کا سلب کرنے والا تصور کرنے لگیں تو پھر "زندہ باد اور پائندہ باد" کے کھوکھلے نعروں کی کوئی اونچی سے اونچی آواز بھی اس اقتدار کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتی۔ ہٹلر سے زیادہ اپنی قوم کا آخر کون ہمدرد اور خیر خواہ ہو سکتا ہے اور مسولینی سے زیادہ اپنے وطن کے لیے کون ایثار کر سکتا ہے لیکن انسان کے فطری حقوق پر دست درازی انہیں اپنے حسرتناک انجام سے نہ بچا سکی۔ انسان جب تک انسان ہے اپنے حقوق سے فطری طور پر پوری طرح واقف اور آشنا ہے اور ان سے دستبردار ہونے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

ہمیں اس بات کو کبھی کبھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ اقتدار کا قیام صرف فوج اور پولیس اور سیم و زر کی فراوانی کا رہین منت نہیں ہوتا۔ اگر اس کی زندگی کا دار و مدار صرف مادی اشیاء پر ہوتا تو آج ایشیا کی کمزور اور بے بس قومیں کبھی آزاد نہ ہوتیں۔ کسی اقتدار کے فنا و بقا کا فیصلہ اس دنیا پر نہیں بلکہ عالمِ بالا میں وہ ذات کرتی ہے جس کے ہاتھ میں ہر قسم کے اقتدار کی باگیں ہیں اور جس کے فیصلوں پر کوئی طاقت اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

(آل عمران - ۳)

آپ کہیے: اے سارے ملکوں کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے دے اور تو جس سے چاہے حکومت چھین لے۔ تو جسے چاہے عزت دے اور تو جسے چاہے ذلت دے۔ تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

جو لوگ ظلم و استبداد کے بل بوتے پر فرمانروائی کے تخت پر متمکن رہنا چاہتے ہیں انہیں اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ایک احتجاج وہ ہے جس کا اظہار زبان کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ اس احتجاج پر بلا شبہ پابندی لگائی جا سکتی ہے لیکن وہ احتجاج جو مظلوم کی آہ و فغاں بن کر خالقِ ارض و سما کی بارگاہ میں جاتا ہے اُسے نہ تو کسی طرح دبایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُس میں کسی قسم کی تاخیر ہو سکتی ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت معاذؓ کو جب یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو انہیں جو مختلف ہدایات دیں اُن میں ایک ہدایت یہ بھی تھی:

اِتَّقِ دعوۃ المظلوم فانّما لیس بینہا وبین اللہ حجاب۔ (بخاری۔ کتاب المظالم)	دیکھو، مظلوم کی بد دعا سے بچتے رہنا کیونکہ اس کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔

مظلوم کی فریاد سے اللہ تعالیٰ کی غیرت کا فوراً جوش میں آنا اللہ تعالیٰ کے رحیم و کریم اور عادل و منصف اور اپنے بندوں پر انتہائی مشفق و مہربان ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ چیز خود اُس کی عظیم ذات کے وجود کی زبردست دلیل ہے۔

اسلام نے ہمیں کائنات کا جو تصور دیا ہے اس کے مطابق یہ کائنات کسی اندھے بہرے لزوم کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ ایک قادرِ مطلق ذات کی تدبیر اور اس کی حکمتِ بالغہ کا نتیجہ ہے اس لیے یہ کائنات اور اُس کا سارا انتظام حق اور عدل جیسی اخلاقی بنیادوں پر قائم ہے اس بنا پر اس کائنات کے انتظام و انصرام میں فیصلہ کُن چیز کوئی بے حس قوت نہیں بلکہ ایک علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ذات ہے جو ہر چھوٹی بڑی شے اور ہر اہم اور غیر اہم فعل پر پوری نگاہ رکھتی ہے اور دیکھتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس کائنات کی اخلاقی بنیادوں کو نقصان نہ

پہنچنے پائے۔ وہ ذات اپنی حکمت کے تحت ظلم و زیادتی کو تھوڑی دیر گوارا کر لیتی ہے تاکہ اس کی جگہ لینے والی قوتوں کی اخلاقی تربیت ہو سکے۔ لیکن وہ کسی قوت کو اس بات کا موقع نہیں دیتی کہ وہ اس کائنات کی اخلاقی اساس کو کوئی معمولی صدمہ بھی پہنچا سکے۔

اگر اس کارگاہِ حیات میں صرف قوت و طاقت کی علمبرداری ہوتی تو پھر تاریخ کے اوراق "تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ" سبق آموز تذکروں سے یکسر خالی ہوتے۔ اس صورت میں جو فرد یا گروہ ایک مرتبہ اقتدار پر قبضہ حاصل کر کے قوت کو غلام بنانے میں کامیاب ہو جاتا، اس کی ہمیشہ بالادستی قائم رہتی اور کوئی دوسرا گروہ اُسے اس کے بلند منصب سے ہٹانے کی جرأت نہ کرتا لیکن تاریخ کے صفحات اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ کچھ لوگ اٹھے اور انھوں نے اپنی قوت فکر و عمل سے اقتدار کی عنان اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور پھر قوم اور ملک کے وسائل پر پوری طرح تسلط حاصل کر کے انہیں کاموں پر صرف کرنا شروع کیا جس سے اس کائنات میں حق اور انصاف کا خون ہوتا تھا اور جبر و استبداد کو تقویت پہنچتی تھی۔ اسی جبر کے تحت یکایک ایک نئی قوت اُبھری، جو ہر قسم کے مادی وسائل سے محروم تھی۔ حکمران طاقت نے اس نوزائیدہ قوت کا ہر طرح راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن اس کے سارے حربوں کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی اور بالآخر اسے اقتدار سے دستکش ہونا پڑا۔ اس مسلسل تغیر و تبدل کا سبب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ جو فرد یا گروہ بھی طاقت کے نشے میں بدمست ہو کر اس کائنات کی اخلاقی بنیادوں کو صدمہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے قوت و طاقت کے باوجود اُسے ختم کر دیا جاتا ہے:

فَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِیَ ظَالِمَةٌ فَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِیْدٍ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ

کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں کتنے ہی کنوئیں بیکار، اور کتنے ہی قصر

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج - ۴۶)

کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ سو کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے ہیں جن سے یہ سمجھنے لگتے یا کان ایسے ہو جاتے جن سے یہ سننے لگتے، اصل یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔

ظالم اور ستمگر جب بھی انسانیت کے کسی طبقے کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بناتے ہیں تو اُس وقت اُن کے ذہن پر یہ باطل خیال پوری طرح چھایا ہوتا ہے کہ یہاں اُن کے مقابلے میں کوئی بالاتر قوت ایسی نہیں جو اُن کی ستمرانیوں پر کوئی گرفت کر سکے۔ اقتدار کے نشے میں بہک کر وہ اپنی ذات کے حدود کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گو وہ زبان سے اپنی خدائی کا دعویٰ نہ کریں لیکن عملاً وہ اپنے آپ کو معبود ہی سمجھتے ہیں۔ یہ زعمِ باطل اللہ تعالیٰ کے وجود، اُس کی ہمہ گیر قدرت و طاقت اور اُس کی قوت احتساب کے خلاف کھلا چیلنج ہے۔ جس کے ڈانڈے شرک اور کفر سے ملے ہوئے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں نہایت واضح الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔ (البقرہ - ۲۵۴)

اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔

برسرِ اقتدار گروہ جتنا زیادہ ظالم اور جابر ہو گا اتنا ہی اُس ملک کے نظم و نسق میں اختلال اور بگاڑ پیدا ہو گا۔ ہر ظالم آمر ہونے کے ساتھ ساتھ پرلے درجے کا خوشامد پسند بھی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اُس کے ظلم و استبداد پر اسے ٹوکنے کے بجائے اس پر مدح و ستائش کے ڈونگرے

برسائے تاکہ اُس کے نفس امّارہ کو غذا فراہم ہو سکے۔ اس کمزوری کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظالموں اور سفّاکوں کے گرد ہمیشہ مصاحبوں کا ہجوم رہتا ہے جو ہر وقت اس بات میں مصروف رہتا ہے کہ کسی طرح اس شخص کو ٹھوس حقائق کی تلخیوں سے دوچار نہ ہونے دیا جائے۔ اُس کی ظالمانہ کارروائیوں سے ملک کے اندر بددلی پھیلتی ہے لیکن یہ ظالم گروہ اُسے مختلف طریقوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ عوام کے اندر غیر معمولی اعتماد پیدا ہو رہا ہے اور وہ حضور کو اپنا واحد نجات دہندہ خیال کرتے ہیں اور آپ کے اشارۂ ابرو پر اپنی گردنیں کٹوانے کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں بلکہ کی عظیم اکثریت بھوک اور افلاس کی وجہ سے سخت پریشان ہوتی ہے لیکن وہ اپنی چرب زبانی سے "حضور" کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ملک خوشحالی کی راہ پہ گامزن ہے لہٰذا لوگوں پر زیادہ سے زیادہ محصولات عائد کر کے اُن سے رقم بٹورنی چاہیے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ طبقہ جو موجودہ حکمرانوں کو اس قسم کی خوش کن مگر نکمّی باتیں سُنا کر اُن کا مزہ کرکرا نہیں ہونے دیتا ہے۔ یہ فرض ان سے پہلے فرمانرواؤں کے ساتھ بھی اسی مہارت اور پابندی کے ساتھ سرانجام دے کر انھیں تخت و تاج سے محروم کر چکا ہوتا ہے اور اپنی وفاداریاں نئے سربراہوں سے وابستہ کر کے انہیں بھی اُن کے پیش روؤں کی طرح "سب اچھا ہے" کے مسحور کن ترانے سنا سنا کر مختلف قسم کی غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں میں مبتلا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں خوشامد میں کیا سحر ہے کہ اقتدار پر فائز لوگ فوراً اس کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور مصاحبین کے اخلاص کو جانتے ہوتے بھی وہ ان پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔

علم النفس نے اس روش کی جہاں تک تحقیق کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کے لیے سب سے کٹھن، صبر آزما اور مشکل منزل یہ ہے کہ اس کے اور اس کے ضمیر کے درمیان سارے حجابات ہٹا کر اسے اُس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جائے۔ ایک انسان سب سے زیادہ اسی مقابلے سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ گریبان میں منہ ڈالنا کوئی بچّوں کا کھیل نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے

اور اس کی جرأت وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے ضمیر بدعنوانیوں کی وجہ سے سیاہ نہ ہو چکے ہوں۔ اس بنا پر ظالم حکمرانوں کے ہاں صرف انہیں لوگوں کی پذیرائی ہوتی ہے جو اُن کے اور اُن کے ضمیر کے مابین نقاب کا کام دیں اور اُن کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض و ملعون وہ افراد ہوا کرتے ہیں جو انہیں ان کی غلطیوں پر ٹوکیں۔ انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کریں، انہیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کریں۔

انسانی فطرت کے جتنے داعیات ہیں اُن میں سے اگر کسی داعیہ کو بھی جائز طریقے سے پورا نہ کیا جائے تو وہ اپنے فطری حق کو وصول کرنے کے لیے بُرے ناجائز طریقے نکال لیتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ یورپ کی جن قوموں نے اولاد کو بوجھ سمجھ کر اس کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے گریز کیا ہے وہاں اولاد کی فطری محبت اور شفقت نے کتوں اور بلیوں سے لگاؤ اور وابستگی کی صورت پیدا کر لی ہے اور وہاں کے لوگ ان جانوروں سے اسی قسم کا اُنس کرتے ہیں جو انسانوں کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔

انسان نے بلاشبہ فطرت کے اس مطالبہ کو کسی دوسرے انداز میں کسی حد تک پورا کر لیا ہے لیکن جب بھی اس کے لیے فطرت کا تجویز کردہ معقول اور مناسب راستہ چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا جائیگا تو وہ لازمی طور پر فطری طریق سے پست اور فروتر ہو گا۔ اور انسانی جبلت کی اُس حد تک تسکین نہ ہو سکے گی جس کا وہ تقاضا کرتی ہے۔

انسانیت کے مختلف داعیات میں ایک زبردست داعیہ یہ بھی ہے کہ وہ کسی بالاتر ہستی کی عقیدت اور محبت کو اپنے دل میں جاگزیں کرے، اُس کی رضا جوئی کے لیے سرگرداں ہو، اُس کی خوشنودی کی خاطر اپنے سکھ، چین، آرام بلکہ زندگی کو تیاگ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ جو اُس ہستی کا مخالف اور دشمن ہو اُس کو اپنا حریف سمجھے اور جو اُس ہستی کا خیر خواہ اور عقیدتمند ہو اُسے اپنا حلیف اور خیر خواہ خیال کرے۔ الغرض اُس کی موافقت و مخالفت، اُس کی دوستی

(باقی صفحہ پر)

تفہیم القرآن

الزمر

(۳)

یہی انسان[۵۷] جب ذرا سی مصیبت اِسے چھو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، اور جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت دے کر اُبھار دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے[۵۸]! نہیں، بلکہ یہ آزمائش ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۵۹]۔ یہی بات اِن سے پہلے گزرے

---

[۵۷] یعنی جسے اللہ کے نام سے چڑ ہے اور اکیلے اللہ کا ذکر سُن کر جس کا چہرہ بگڑنے لگتا ہے۔

[۵۸] اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس نعمت کا اہل ہوں اسی لیے اس نے مجھے یہ کچھ دیا ہے، ورنہ اگر اس کے نزدیک میں ایک بُرا اور بدعقیدہ اور غلط کار آدمی ہوتا تو مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو مجھے میری قابلیت کی بنا پر ملا ہے۔

[۵۹] لوگ اپنی جہالت و نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جسے کوئی نعمت مل رہی ہے وہ لازماً اس کی اہلیت و قابلیت کی بنا پر مل رہی ہے، اور اس نعمت کا ملنا اُس کے مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی علامت یا دلیل ہے۔ حالانکہ یہاں جس کو جو کچھ بھی دیا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کے طور پر دیا جا رہا ہے۔ یہ امتحان کا سامان ہے نہ کہ قابلیت کا انعام، ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ بہت سے قابل آدمی خستہ حال ہیں اور بہت سے ناقابل آدمی نعمتوں میں کھیل رہے ہیں۔ اسی طرح یہ دنیوی نعمتیں مقبولِ بارگاہ ہونے کی علامت بھی نہیں ہیں۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ دنیا میں بکثرت ایسے نیک آدمی مصائب میں مبتلا ہیں جن کے نیک ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور بہت سے بُرے آدمی، جن کی قبیح حرکات سے ایک دنیا واقف ہے، عیش کر رہے ہیں۔ اب کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی ایک کی مصیبت اور

ہوئے لوگ بھی کہہ چکے ہیں، مگر جو کچھ وہ کماتے تھے وہ ان کے کسی کام نہ آیا۔[۶۸] پھر اپنی کمائی
کے بُرے نتائج انہوں نے بھگتے، اور ان لوگوں میں سے بھی جو ظالم ہیں وہ عنقریب اپنی کمائی
کے بُرے نتائج بھگتیں گے، یہ ہمیں عاجز کر دینے والے نہیں ہیں۔ اور کیا انہیں معلوم نہیں
ہے کہ اللہ جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے؟[۶۹]
اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ع ۵
(اے نبی)، کہہ دو کہ اے میرے بندو،[۷۰] جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے،

دوسرے کے عیش کو اس بات کی دلیل بنا سکتا ہے کہ نیک انسان کو اللہ پسند نہیں کرتا اور بد انسان کو وہ پسند کرتا ہے؟

۶۸ مطلب یہ ہے کہ جب ان کی شامت آئی تو وہ قابلیت بھی دھری رہ گئی جس کا انہیں دعویٰ تھا، اور یہ بات بھی کھل گئی کہ وہ اللہ کے مقبول بندے نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کی یہ کمائی مقبولیت اور صلاحیت کی بنا پر ہوتی تو شامت کیسے آجاتی۔

۶۹ یعنی رزق کی تنگی و کشادگی اللہ کے ایک دوسرے ہی قانون پر مبنی ہے جس کے مصالح کچھ اور ہیں۔ اس تقسیمِ رزق کا مدار آدمی کی اہلیت و قابلیت، یا اس کے محبوب و مغضوب ہونے پر ہرگز نہیں ہے (اس مضمون کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحات ۲۰۲-۲۱۲-۲۲۱-۲۷۴-۲۷۵-۳۲۲-۳۳۴-۴۵۷-جلد سوم، صفحات ۲۶-۷۷-۷۸-۱۲۹-۱۸۹-۱۹۱-۱۹۲-۲۵۹-۲۶۰-۲۸۳-۲۸۴-۵۱۳-۵۱۶-۶۶۲-۶۶۴-حواشی سورۂ سبا ۵۴ تا ۶۰۔

۷۰ بعض لوگوں نے ان الفاظ کی یہ عجیب تاویل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود "اے میرے بندو" کہہ کر لوگوں سے خطاب کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا سب انسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک ایسی تاویل ہے جسے تاویل نہیں بلکہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف اور اللہ تعالیٰ کے کلام کے ساتھ کھیل کہنا چاہیے۔ جاہل عقیدت مندوں کا کوئی گروہ تو اس نکتے کو سُن کر جھوم اٹھے گا، لیکن یہ تاویل اگر صحیح ہو تو پھر پورا قرآن غلط ہوا جاتا ہے، کیونکہ قرآن تو ازاول تا آخر

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور رحیم ہے۔ پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اُس کے قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی، قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آئے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کہے "افسوس میری اُس تقصیر پر جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا، بلکہ میں تو اُلٹا مذاق اُڑانے والوں میں شامل تھا" یا کہے "کاش اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں بھی متقیوں میں سے ہوتا" یا عذاب دیکھ کر کہے "کاش مجھے ایک موقع اور مل جاتا اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں

انسانوں کو صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیتا ہے، اور اس کی ساری دعوت ہی یہ ہے کہ تم ایک اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود بندے تھے۔ ان کو اللہ نے رب نہیں بلکہ رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس لیے بھیجا تھا کہ خود بھی اُسی کی بندگی کریں اور لوگوں کو بھی اسی کی بندگی سکھائیں۔ آخر کسی صاحبِ عقل آدمی کے دماغ میں یہ بات کیسے سما سکتی ہے کہ مکہ معظمہ میں کفارِ قریش کے درمیان کھڑے ہو کر ایک روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یکایک یہ اعلان کر دیا ہو گا کہ تم عبدالعزّٰی اور عبدشمس کے بجائے دراصل عبدِ محمد ہو، اعاذنا اللہ من ذالک۔

اسے یہ خطاب تمام انسانوں سے ہے، صرف اہلِ ایمان کو مخاطب قرار دینے کے لیے کوئی وزنی دلیل نہیں ہے۔ اور جیسا کہ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے، عام انسانوں کو مخاطب کر کے یہ بات ارشاد فرمانے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر توبہ و انابت کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، بلکہ بعد والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی وضاحت فرما دی ہے کہ گناہوں کی معافی کی صورت بندگی و اطاعت کی طرف پلٹ آنا اور اللہ کے نازل کیے ہوئے پیغام کی پیروی اختیار کر لینا ہے۔ دراصل یہ آیت ان لوگوں کے لیے پیغامِ امید لے کر آئی تھی جو جاہلیت میں قتل، زنا، چوری، ڈاکے اور ایسے ہی سخت گناہوں میں غرق رہ چکے تھے اور اس بات سے مایوس تھے کہ یہ قصور کبھی معاف ہو سکیں گے۔ اُن سے فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، جو کچھ بھی تم کر چکے ہو اس کے بعد اب اگر اپنے رب کی اطاعت کی طرف پلٹ آؤ تو

میں شامل ہو جاؤں"۔ (اور اُس وقت اسے یہ جواب ملے کہ) "کیوں نہیں، میری آیات تیرے
پاس آچکی تھیں، پھر تُو نے انہیں جھٹلایا اور تکبّر کیا اور تو کافروں میں سے تھا"۔ آج جن لوگوں نے
خدا پر جھوٹ باندھے ہیں قیامت کے روز تم دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہونگے۔ کیا جہنّم میں
متکبروں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے؟ اس کے برعکس جن لوگوں نے یہاں تقویٰ کیا ہے ان کے
اسباب کامیابی کی وجہ سے اللہ ان کو نجات دے گا، ان کو نہ کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہونگے۔
اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے[۷۳]۔ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کی
کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں وہی گھاٹے میں رہنے والے
ہیں ع (اے نبیؐ)، ان سے کہو "پھر کیا اے جاہلو، تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے ۶ع
مجھ سے کہتے ہو؟" (یہ بات تمہیں ان سے صاف کہہ دینی چاہیے کیونکہ) تمہاری طرف اور تم سے
پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل
ضائع ہو جائے گا[۷۴] اور تم خسارے میں رہو گے۔ لہٰذا (اے نبیؐ) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور

سب کچھ معاف ہو جائے گا۔ اس آیت کی یہی تاویل ابن عباس، قتادہ، مجاہد اور ابن زید نے بیان کی ہے (ابن جریر، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد سوم ۴۶۶ تا ۴۶۸۔

۷۲؎ کتاب اللہ کے بہترین پہلو کی پیروی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے آدمی ان کی تعمیل کرے، جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے ان سے بچے، اور امثال اور قصوں میں جو کچھ اس نے ارشاد فرمایا ہے اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔ بخلاف اس کے جو شخص حکم سے منہ موڑتا ہے، منہیات کا ارتکاب کرتا ہے اور اللہ کے وعظ و نصیحت سے کوئی اثر نہیں لیتا وہ کتاب اللہ کے بدترین پہلو کو اختیار کرتا ہے، یعنی وہ پہلو اختیار کرتا ہے جسے کتاب اللہ بدترین قرار دیتی ہے۔

۷۳؎ یعنی اس نے دنیا کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ وہی ہر چیز کی خبر گیری اور نگہبانی کر رہا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں جس طرح اس کے پیدا کرنے سے وجود میں آئی ہیں اسی طرح وہ اس کے باقی رکھنے سے باقی ہیں، اُس کے پرورش کرنے سے پھل پھول رہی ہیں، اور اس کی حفاظت و نگرانی میں کام کر رہی ہیں

شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ۔

اِن لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے[۵۸]۔ (اس کی قدرتِ کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ)، قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہو گی اور آسمان اس کے دستِ راست میں لپیٹے ہوتے ہوں گے[۵۹]۔ پاک اور بالاتر ہے وہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں[۶۰]۔

---

[۵۷] یعنی شرک کے ساتھ کسی عمل کو عملِ صالح قرار نہیں دیا جائے گا، لہٰذا جو شخص بھی مشرک رہتے ہوتے اپنے نزدیک بہت سے کاموں کو نیک کام سمجھتے ہوئے کرے گا ان پر وہ کسی اجر کا مستحق نہ ہو گا اور اس کی پوری زندگی سراسر زیاں کاری بن کر رہ جائے گی۔

[۵۸] یعنی ان کو اللہ کی عظمت و کبریائی کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ خداوندِ عالم کا مقام کتنا بلند ہے اور وہ حقیر ہستیاں کیا شے ہیں جن کو یہ نادان لوگ خدائی میں شریک اور معبودیت کا حق دار بنائے بیٹھے ہیں۔

[۵۹] زمین اور آسمان پر اللہ تعالیٰ کے کامل اقتدار و تصرف کی تصویر کھینچنے کے لیے مٹھی میں ہونے اور ہاتھ پر لپیٹے ہونے کا استعارہ استعمال فرمایا گیا ہے۔ جس طرح ایک آدمی کسی چھوٹی سی گیند کو مٹھی میں دبا لیتا ہے اور اس کے لیے یہ ایک معمولی کام ہے، یا ایک شخص ایک رومال کو لپیٹ کر ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اس کے لیے یہ کوئی زحمت طلب کام نہیں ہوتا، اسی طرح قیامت کے روز تمام انسان (جو آج اللہ کی عظمت و کبریائی کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں) اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ زمین اور آسمان اللہ کے دستِ قدرت میں ایک حقیر گیند اور ایک ذرا سے رومال کی طرح ہیں۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایات منقول ہوئی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ دوران خطبہ میں یہ آیت آپ نے تلاوت فرمائی اور فرمایا "اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں (یعنی سیاروں) کو اپنی مٹھی میں لیکر اس طرح پھرائے گا جیسے ایک بچہ گیند پھراتا ہے، اور فرمائے گا میں ہوں خدائے واحد؛ میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جبّار، میں ہوں کبریائی کا مالک، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں جبّار؟

اور اُس روز صور پھونکا جائے گا[۸۸] اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے اُن کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے[۸۹]۔ زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی، کتابِ اعمال لا کر رکھ دی جائے گی، انبیاء اور تمام گواہ[۹۰] حاضر کر دیئے جائیں گے، لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور اُن پر کوئی ظلم نہ ہوگا، اور ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے عمل کیا تھا اُس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے[۹۱]۔ ع

کہاں ہیں متکبر؟ یہ کہتے کہتے حضور پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ ہمیں خطرہ ہونے لگا کہ کہیں آپ منبر سمیت گر نہ پڑیں۔

[۸۷] یعنی کہاں اُس کی یہ شان عظمت و کبریائی اور کہاں اس کے ساتھ خدائی میں کسی کا شریک ہونا۔

[۸۸] صور کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، ص ۵۵۲، جلد دوم، ص ۴۹۲۔ جلد سوم صفحات ۴۸، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۹۹، ۳۰۰، ۶۰۶۔

[۸۹] یہاں صرف دو مرتبہ صور پھونکے جانے کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ سورۂ نمل میں ان دونوں سے پہلے ایک اور نفخ صور کا ذکر بھی آیا ہے جسے سُن کر زمین و آسمان کی ساری مخلوق دہشت زدہ ہو جائے گی (آیت ۸۷)۔ اسی بنا پر احادیث میں تین مرتبہ نفخ صور واقع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک نفخۃ الفزع، یعنی گھبرا دینے والا صور۔ دوسرا نفخۃ الصعق، یعنی مار گرانے والا صور۔ تیسرا نفخۃ القیام لرب العالمین، یعنی وہ صور جسے پھونکتے ہی تمام انسان جی اٹھیں گے اور اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنے مرقدوں سے نکل آئیں گے۔

[۹۰] گواہوں سے مراد وہ گواہ بھی ہیں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا گیا تھا، اور وہ گواہ بھی جو لوگوں کے اعمال کی شہادت پیش کریں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ گواہ صرف انسان ہی ہوں۔ فرشتے اور جن اور حیوانات، اور انسانوں کے اپنے اعضاء

(اِس فیصلہ کے بعد) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا جہنّم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے[۸۱] اور اُس کے کارندے ان سے کہیں گے "کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے، جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا؟"۔ وہ جواب دینگے "ہاں، آئے تھے، مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا"۔ کہا جائے گا، داخل ہو جاؤ جہنّم کے دروازوں میں، یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے یہ متکبّروں کے لیے۔

اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے، اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہونگے، تو اُس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ "سلام ہو تم پر، بہت اچھے رہے، داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے"۔ اور وہ کہیں گے "شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا[۸۲]، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں[۸۳]"۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے[۸۴]۔

اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد اور تسبیح کر رہے ہونگے، اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ چکا دیا جائے گا، اور

اور در و دیوار اور شجر و حجر، سب ان گواہوں میں شامل ہوں گے۔

[۸۱] یعنی جہنّم کے دروازے پہلے سے کھلے نہ ہوں گے بلکہ ان کے پہنچنے پر کھولے جائیں گے جس طرح مجرموں کے پہنچنے پر جیل کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور ان کے داخل ہوتے ہی بند کر دیا جاتا ہے۔

[۸۲] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم صفحات ۱۲۵، ۱۲۴ - ۱۳۵، ۱۸۹ تا ۱۹۲۔

[۸۳] یعنی ہم میں سے ہر ایک کو جو جنت بخشی گئی ہے وہ اب ہماری ملک ہے اور ہمیں اس میں پورے اختیارات حاصل ہیں۔

ع ۸ پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ رب العالمین کے لیے ۹۵ ع

۹۴ ہو سکتا ہے کہ یہ اہلِ جنت کا قول ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہلِ جنت کی بات پر یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ اضافہ ارشاد فرمایا گیا ہو۔

۹۵ یعنی پوری کائنات اللہ کی حمد پکار اٹھے گی۔

المؤمن

نام | آیت ۲۸ کے فقرے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ سورہ جس میں اُس خاص مومن کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول | ابن عباس اور جابر بن زید کا بیان ہے کہ یہ سورۃ سورۂ زُمَر کے بعد متصلاً نازل ہوئی ہے اور اس کا جو مقام قرآن مجید کی موجودہ ترتیب میں ہے وہی ترتیب نزول کے اعتبار سے بھی ہے۔

حالاتِ نزول | جن حالات میں یہ سورہ نازل ہوئی ہے اُن کی طرف صاف اشارات اِس کے مضمون میں موجود ہیں۔ کفارِ مکہ نے اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دو طرح کی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ ایک یہ کہ ہر طرف جھگڑے اور بحثیں چھیڑ کر طرح طرح کے اُلٹے سیدھے سوالات اٹھا کر اور نت نئے الزامات لگا کر قرآن کی تعلیم اور اسلام کی دعوت اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنے شبہات اور وسوسے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیئے جائیں کہ ان کو صاف کرتے کرتے آخر کار حضورؐ اور اہلِ ایمان زِچ ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کو قتل کر دینے کے لیے زمین ہموار کی جاتے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے وہ پیہم سازشیں کر رہے تھے، اور ایک مرتبہ تو عملاً انہوں نے اس کا اقدام کر بھی ڈالا تھا۔ بخاری میں حضرت

عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یکایک عُقْبَہ بن ابی مُعیط آگے بڑھا اور اُس نے آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اسے بل دینا شروع کر دیا تاکہ گلا گھونٹ کر آپ کو مار ڈالے۔ مگر عین وقت پر حضرت ابوبکر پہنچ گئے اور انہوں نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا۔ حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ جس وقت ابوبکر صدیق اُس ظالم سے کشمکش کر رہے تھے اس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ (کیا تم ایک شخص کو صرف اِس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟)۔ تھوڑے اختلاف کے ساتھ یہ واقعہ سیرت ابن ہشام میں بھی منقول ہوا ہے اور نسائی اور ابن ابی حاتم نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

موضوع اور مباحث | صورتِ حال کے اِن دونوں پہلوؤں کو آغازِ تقریر ہی میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے اور پھر آگے کی پوری تقریر انہی دونوں پر ایک انتہائی مؤثر اور سبق آموز تبصرہ ہے۔

قتل کی سازشوں کے جواب میں مومنِ آلِ فرعون کا قصہ سنایا گیا ہے (آیات ۲۳ تا ۵۵) اور اِس قصے کے پیرائے میں تین گروہوں کو تین مختلف سبق دیئے گئے ہیں:-

۱- کفار کو بتایا گیا ہے کہ جو کچھ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرنا چاہتے ہو یہی کچھ اپنی طاقت کے بھروسے پر فرعون حضرت موسیٰ کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، اب کیا یہ حرکتیں کر کے تم بھی اُسی انجام سے دوچار ہونا چاہتے ہو جس سے وہ دوچار ہوا؟

۲- محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کو سبق دیا گیا ہے کہ یہ ظالم بظاہر خواہ کتنے ہی بالادست اور چیرہ دست ہوں، اور ان کے مقابلہ میں تم خواہ کتنے ہی کمزور اور بے بس ہو، مگر تمہیں یقین رکھنا چاہیے کہ جس خدا کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے تم کام کر رہے ہو اس کی طاقت ہر دوسری طاقت پر بھاری ہے۔

لہٰذا جو بڑی سے بڑی خوفناک دھمکی بھی یہ تمہیں دے سکتے ہیں، اس کے جواب میں بس خدا کی پناہ مانگ لو اور اس کے بعد بالکل بے خوف ہو کر اپنے کام میں لگ جاؤ۔ خدا پرست کے پاس ظالم کی ہر دھمکی کا بس ایک ہی جواب ہے، اور وہ ہے اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ۔ اس طرح خدا کے بھروسے پر خطرات سے بے پروا ہو کر کام کرو گے تو آخر کار اس کی نصرت آ کر رہے گی اور آج کے فرعون بھی وہی کچھ دیکھ لیں گے جو کل کے فرعون دیکھ چکے ہیں۔ وہ وقت آنے تک ظلم و ستم کے جو طوفان بھی امنڈ امنڈ کر آئیں انہیں صبر کے ساتھ تمہیں برداشت کرنا ہی ہو گا۔

۳۔ اِن دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی معاشرے میں موجود تھا، اور وہ اُن لوگوں کا گروہ تھا جو دلوں میں جان چکے تھے کہ حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ ہے اور کفارِ قریش سراسر زیادتی کر رہے ہیں۔ مگر یہ جان لینے کے باوجود وہ خاموشی کے ساتھ حق و باطل کی اس کشمکش کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس موقع پر اُن کے ضمیر کو جھنجوڑا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ جب حق کے دشمن علانیہ تمہاری آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظالمانہ اقدام کرنے پر تل گئے ہیں تو حیف ہے تم پر اگر اب بھی تم بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہو۔ اس حالت میں جس شخص کا ضمیر بالکل مر نہ چکا ہو اُسے تو اٹھ کر وہ فرض انجام دینا چاہیے جو فرعون کے بھرے دربار میں اُس کے اپنے درباریوں میں سے ایک راستباز آدمی نے اُس وقت انجام دیا تھا جب فرعون نے حضرت موسیٰ کو قتل کرنا چاہا تھا۔ جو مصلحتیں تمہیں زبان کھولنے سے باز رکھ رہی ہیں یہی مصلحتیں اُس شخص کے آگے بھی راستہ روک کر کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر اُس نے اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰہِ کہہ کر ان ساری مصلحتوں کو ٹھکرا دیا، اور اس کے بعد دیکھ لو کہ فرعون اُس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

اب رہا کفار کا وہ مجادلہ جو حق کو نیچا دکھانے کے لیے مکّہ معظمہ میں شب و روز جاری تھا، تو اس کے جواب میں ایک طرف دلائل سے توحید اور آخرت کے اُن عقائد کا برحق ہونا ثابت کیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اور کفار کے درمیان اصل بنائے نزاع تھے، اور یہ حقیقت صاف کھول کر رکھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ کسی علم اور کسی دلیل و حجت کے بغیر ان سچائیوں کے خلاف خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف اُن اصل محرکات کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کی بنا پر سردارانِ قریش اس قدر سرگرمی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ بظاہر انہوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ حضوؐر کی تعلیم اور آپ کے دعوائے نبوت پر انہیں حقیقی اعتراضات ہیں جن کی وجہ سے وہ اِن باتوں کو نہیں مان رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اُن کے لیے محض ایک جنگِ اقتدار تھی۔ آیت ۵۶ میں یہ بات کسی لاگ لپیٹ کے بغیر اُن سے صاف کہہ دی گئی ہے کہ تمہارے انکار کی اصل وجہ وہ کبر ہے جو تمہارے دلوں میں بھرا ہوا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اگر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت تسلیم کر لیں گے تو تمہاری بڑائی قائم نہ رہ سکے گی۔ اسی وجہ سے تم اُن کو زک دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو۔

اسی سلسلے میں کفار کو پے در پے تنبیہات کی گئی ہیں کہ اگر اللہ کی آیات کے مقابلے میں مجادلہ کرنے سے باز نہ آؤ گے تو اُسی انجام سے دوچار ہو گے جس سے پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں اور اس سے بدتر انجام تمہارے لیے آخرت میں مقدر ہے۔ اُس وقت تم پچھتاؤ گے، مگر اس وقت کا پچھتانا تمہارے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

حٰ مٓ۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے، سب کچھ جاننے والا ہے، گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحبِ فضل ہے۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں، اُسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔[1]

---

[1] یہ تقریر کی تمہید ہے جس کے ذریعہ سے سامعین کو پہلے ہی خبردار کر دیا گیا ہے کہ یہ کلام جو اُن کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، کسی معمولی ہستی کا کلام نہیں ہے، بلکہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جس کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ پھر پے در پے اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کی گئی ہیں جو آگے کے مضمون سے گہری مناسبت رکھتی ہیں:

اوّل یہ کہ وہ "زبردست" ہے، یعنی سب پر غالب ہے۔ اس کا جو فیصلہ بھی کسی کے حق میں ہو نافذ ہی ہو کر رہتا ہے۔ کوئی اس سے لڑ کر جیت نہیں سکتا، نہ اس کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے فرمان سے منہ موڑ کر اگر کوئی شخص کامیابی کی توقع رکھتا ہو، اور اس کے رسول سے جھگڑا کر کے یہ امید رکھتا ہو کہ وہ اسے نیچا دکھا دے گا، تو یہ اس کی اپنی حماقت ہے۔ ایسی توقعات کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

دوسری صفت یہ کہ وہ "سب کچھ جاننے والا" ہے۔ یعنی وہ قیاس و گمان کی بنا پر کوئی بات نہیں کرتا بلکہ ہر چیز کا براہِ راست علم رکھتا ہے، اس لیے ماورائے حس و ادراک حقیقتوں کے متعلق جو معلومات وہ دے رہا ہے، صرف وہی صحیح ہو سکتی ہیں، اور ان کو نہ ماننے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی خواہ مخواہ جہالت کی پیروی کرے۔ اسی طرح وہ جانتا ہے کہ انسان کی فلاح کس چیز میں ہے اور کون سے اصول و قوانین اور احکام اس کی بہتری کے لیے ضروری ہیں۔ اُس کی ہر تعلیم حکمت اور علم صحیح پر مبنی ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں ہے۔ لہٰذا اُس کی ہدایات کو قبول نہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی خود اپنی تباہی کے راستے پر جانا چاہتا ہے۔ پھر انسانوں کی حرکات و سکنات میں سے کوئی چیز اُس سے چھپی نہیں رہ سکتی، حتیٰ کہ وہ ان نیتوں اور ارادوں تک کو جانتا ہے جو انسانی افعال کے

اصل محرک ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کسی بہانے اُس کی سزا سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

تیسری صفت یہ کہ وہ "گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے"۔ یہ امید اور ترغیب دلانے والی صفت ہے جو اس غرض سے بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ اب تک سرکشی کرتے رہے ہیں وہ مایوس نہ ہوں، بلکہ یہ سمجھتے ہوئے اپنی روش پر نظرثانی کریں کہ اگر اب بھی وہ اس روش سے باز آجائیں تو اللہ کے دامنِ رحمت میں جگہ پا سکتے ہیں۔ اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ گناہ معاف کرنا اور توبہ قبول کرنا لازماً ایک ہی چیز کے دو عنوان نہیں ہیں، بلکہ بسا اوقات توبہ کے بغیر بھی اللہ کے ہاں گناہوں کی معافی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً ایک شخص خطائیں بھی کرتا رہتا ہے اور نیکیاں بھی، اور اس کی نیکیاں اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہیں، خواہ اُسے ان خطاؤں پر توبہ و استغفار کرنے کا موقع نہ ملا ہو، بلکہ وہ انہیں بھول بھی چکا ہو۔ اسی طرح ایک شخص پر دنیا میں جتنی بھی تکلیفیں اور مصیبتیں اور بیماریاں اور طرح طرح کی رنج و غم پہنچانے والی آفات آتی ہیں، وہ سب اس کی خطاؤں کا بدل بن جاتی ہیں۔ اسی بنا پر گناہوں کی معافی کا ذکر توبہ قبول کرنے سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ توبہ کے بغیر خطابخشی کی یہ رعایت صرف اہلِ ایمان کیلئے ہے اور اہلِ ایمان میں بھی صرف اُن کے لیے جو سرکشی و بغاوت کے ہر جذبے سے خالی ہوں اور جن سے گناہوں کا صدور بشری کمزوری کی وجہ سے ہوا ہو نہ کہ استکبار اور معصیت پر اصرار کی بنا پر۔

چوتھی صفت یہ کہ وہ "سخت سزا دینے والا" ہے۔ اِس صفت کا ذکر کرکے لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ بندگی کی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ جتنا رحیم ہے، بغاوت و سرکشی کا رویّہ اختیار کرنے والوں کے لیے اُتنا ہی سخت ہے۔ جب کوئی شخص یا گروہ ان تمام حدوں سے گزر جاتا ہے جہاں تک وہ اُس کے درگزر اور اس کی خطابخشی کا مستحق ہو سکتا ہے، تو پھر وہ اس کی سزا کا مستحق بنتا ہے، اور اس کی سزا ایسی ہولناک ہے کہ صرف ایک احمق انسان ہی اُس کو قابلِ برداشت سمجھ سکتا ہے۔

پانچویں صفت یہ کہ وہ "صاحبِ فضل" ہے، یعنی کشادہ دست، غنی اور فیاض ہے۔ تمام

اللہ کی آیات میں جھگڑے نہیں کرتے[۳۲] مگر صرف وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے[۳۳]، اس کے

مخلوقات پر اس کی نعمتوں اور اس کے احسانات کی ہمہ گیر بارش ہر آن ہو رہی ہے۔ بندوں کو جو کچھ بھی مل رہا ہے اُسی کے فضل و کرم سے مل رہا ہے۔

اِن پانچ صفات کے بعد دو حقیقتیں واشگاف طریقہ سے بیان کردی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ معبودِ حقیقی اُس کے سوا کوئی نہیں ہے، خواہ لوگوں نے کتنے ہی دوسرے جھوٹے معبود بنا رکھے ہوں۔ دوسری یہ کہ جانا سب کو آخرکار اسی کی طرف ہے۔ کوئی دوسرا معبود لوگوں کے اعمال کا حساب لینے والا اور ان کی جزا و سزا کا فیصلہ کرنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑ کر اگر کوئی دوسروں کو معبود بنائے گا تو اپنی اس حماقت کا خمیازہ خود بھگتے گا۔

[۳۲] جھگڑا کرنے سے مراد ہے کج بحثیاں کرنا۔ مین میخ نکالنا۔ اُلٹے سیدھے اعتراضات جڑنا۔ سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی ایک لفظ یا فقرہ لے اُڑنا اور اُس سے طرح طرح کے نکتے پیدا کر کے شبہات و الزامات کی عمارتیں کھڑی کرنا۔ کلام کے اصل مدعا کو نظرانداز کر کے اس کو غلط معنی پہنانا تاکہ آدمی نہ خود بات کو سمجھے نہ دوسروں کو سمجھنے دے۔ یہ طرزِ اختلاف لازماً صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کا اختلاف بدنیتی پر مبنی ہوتا ہے۔ نیک نیت مخالف اگر بحث کرتا بھی ہے تو تحقیق کی غرض سے کرتا ہے اور اصل مسائلِ زیرِ بحث پر گفتگو کر کے یہ اطمینان کرنا چاہتا ہے کہ ان مسائل میں اس کا اپنا نقطۂ نظر درست ہے، یا فریقِ مخالف کا۔ اِس قسم کی بحث حق معلوم کرنے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ کسی کو نیچا دکھانے کے لیے۔ بخلاف اس کے بدنیت مخالف کا اصل مقصد سمجھنا اور سمجھانا نہیں ہوتا بلکہ وہ فریقِ ثانی کو زک دینا اور زچ کرنا چاہتا ہے اور بحث کے میدان میں اس لیے اترتا ہے کہ دوسرے کی بات کسی طرح چلنے نہیں دینی ہے۔ اسی وجہ سے وہ کبھی اصل مسائل کا سامنا نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اطراف ہی میں چھاپے مارتا رہتا ہے۔

[۳۳] "کفر" کا لفظ یہاں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک کفرانِ نعمت۔ دوسرے انکارِ حق۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی آیات کے مقابلہ میں یہ طرزِ عمل صرف

بعد دنیا کے ملکوں میں ان کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے[۵]۔ اِن سے پہلے نوح کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے، اور اُس کے بعد بہت سے دوسرے جتھوں نے بھی یہ کام کیا ہے۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اُسے گرفتار کرے۔ اُن سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا، پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ اِسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی اُن سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے جو کفر کے مرتکب ہوئے

وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو اُس کے احسانات کو بھول گئے ہیں اور جنہیں یہ احساس نہیں رہا ہے کہ اُسی کی نعمتیں ہیں جن کے بل پر وہ پل رہے ہیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جنہوں نے حق سے منہ موڑ لیا ہے اور اُسے نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سیاق و سباق کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کفر کرنے والے سے مراد ہر وہ شخص نہیں ہے جو مسلمان نہ ہو۔ اس لیے کہ جو غیر مسلم اسلام کو سمجھنے کی غرض سے نیک نیتی کے ساتھ بحث کرے اور تحقیق کی غرض سے وہ باتیں سمجھنے کی کوشش کرے جن کے سمجھنے میں اسے زحمت پیش آ رہی ہو، اگرچہ اسلام قبول کرنے سے پہلے تک اصطلاحاً ہوتا وہ بھی کافر ہی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اُس پر وہ بات راست نہیں آتی جس کی اِس آیت میں مذمت کی گئی ہے۔

[۵] پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک خلا ہے جسے ذہنِ سامع پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ فحوائے کلام سے یہ بات خود بخود مترشح ہوتی ہے کہ اللہ عزّوجل کی آیات کے مقابلے میں جو لوگ یہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، وہ سزا سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ لامحالہ ایک نہ ایک روز ان کی شامت آنی ہے۔ اب اگر تم دیکھ رہے ہو کہ وہ لوگ یہ سب کچھ کر کے بھی خدا کی زمین میں اطمینان سے دندناتے پھر رہے ہیں اور اُن کے کاروبار خوب چمک رہے ہیں اور ان کی حکومتیں بڑی شان سے چل رہی ہیں، اور وہ خوب دادِ عیش دے رہے ہیں، تو اِس دھوکے میں نہ پڑ جاؤ کہ وہ خدا کی پکڑ سے بچ نکلے ہیں، یا خدا کی آیات سے جنگ کوئی کھیل ہے جسے تفریح کے طور پر کھیلا جا سکتا ہے اور اس کا کوئی بُرا نتیجہ اِس کھیل کے کھلاڑیوں کو کبھی نہ دیکھنا پڑے گا۔ یہ تو دراصل ایک مہلت ہے جو خدا کی

ہیں کہ وہ واصل بجہنم ہونے والے ہیں ؎

طرف سے ان کو مل رہی ہے۔ اِس مہلت سے غلط فائدہ اٹھا کر جو لوگ جس قدر زیادہ شرارتیں کرتے ہیں ان کی کشتی اسی قدر زیادہ بھر کر ڈوبتی ہے۔

؎ یعنی دنیا میں جو عذاب اُن پر آیا وہ ان کی آخری سزا نہ تھی بلکہ اللہ نے یہ فیصلہ بھی ان کے حق میں کر دیا ہے کہ ان کو واصل بجہنم ہونا ہے۔ ایک دوسرا مطلب اِس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح پچھلی قوموں کی شامت آ چکی ہے اسی طرح اب جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان کے حق میں بھی اللہ کا یہ فیصلہ طے شدہ ہے کہ وہ واصل بجہنم ہونے والے ہیں۔

دینی طریقِ حیات

(اے۔ کے۔ بروہی)

[ہمارے ملک کے ممتاز قانون دان جناب اے۔ کے۔ بروہی ایڈووکیٹ نے مارچ ۷۴ء میں پشاور یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام آل پاکستان اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اجلاس سوم کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی میں ایک مقالہ "ریلیجس وے آف لائف" کے زیرِ عنوان پڑھا تھا، جو اپنے عمدہ اور بصیرت افروز مندرجات کی بنا پر بہت پسند کیا گیا تھا اور پریس میں بھی اس کا کچھ خلاصہ اشاعت پذیر ہوا تھا۔ ہم اس پورے مقالے کا ترجمہ افادۂ عام کی غرض سے پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کیلئے اس کا مطالعہ دلچسپی و سودمندی کا موجب ہوگا۔ غ ع!]

(۱)

دین و مذہب نے ایک قدیم انسانی ادارے کی حیثیت سے بشری آزادی کے صحیح استعمال میں بڑا مفید اور قابلِ قدر فریضہ سرانجام دیا ہے۔ جہاں آزادی موجود نہ ہو وہاں دینی زندگی کا وجود ممکن نہیں ہے، کیونکہ آزادئ عمل کے بعد ہی انسان کے افعال کے بارے میں خطا و صواب کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے دین میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اولین مقام حاصل ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کے خالق نے اسے آزادی و اختیار کا جو عظیم عطیہ عنایت فرمایا ہے وہ اسے صحیح اور بجا مصرف میں صرف کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دین کے انتخاب میں جبر و اکراہ کو روا نہیں رکھا گیا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے) جہاں جبر ہوگا وہاں آزادئ انتخاب مفقود ہوگی اور دین کا اصل منشا و مدعا اسی آزادئ انتخاب کے لیے قواعد و ضوابط مقرر کرنا ہے۔ جبر و اکراہ سے انسانی آزادی میں نظم و ضبط پیدا نہیں ہوتا،

بلکہ جبر سے "حریتِ بشری" کا کلی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کائنات کا مادّی و طبیعی نظام اپنی ساری تفصیلات و جزئیات سمیت ایک "قانون لزوم" کا پابند اور مسخر ہے جس سے سرتابی اور انحراف اس کے کسی جُز کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کے برعکس انسان کے لیے حرّیت مقدر کر دی گئی ہے۔ اُسے قدرت نے آزادی ودیعت کی ہے جسے وہ متعین حدود کے اندر جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس امانت میں غلط طریق پر بھی تصرف کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح وہ اپنے روحانی ارتقاء اور نشوونما ئی میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ دوسری طرف اُسے اس امر کے بھی مواقع حاصل ہیں کہ وہ اپنی آزادانہ رضا و اختیار کے ساتھ اپنے آپ کو قانون الٰہی کا تابع بنا لے اور اپنے خالق کے اوامر و نواہی کا پابند ہو جائے۔ انسان کی آزادی اس حقیقت کی متضمن ہے کہ وہ زندگی کے ہر قدم پر دو یا اس سے زاید راستے اختیار کر سکتا ہے۔ انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کا مطلب اولاً یہ ہے کہ اُسے یہ معلوم ہو کہ مختلف طرز ہائے عمل میں سے صحیح اور جائز کونسا ہے، اور ثانیاً یہ کہ اُسے اتنی قوتِ ارادی حاصل ہو کہ وہ جس طریقے کو درست سمجھے، اُسے اختیار کر سکے۔ غرض یہ کہ خیر کی دعوت قبول کرنا، نیکی اور بدی میں تمیز کرنا اور اس کے بعد بُری ترغیبات کی جانب مائل ہوئے بغیر صراطِ مستقیم پر گامزن رہنا اخلاقیات کا اصل الاصول ہے۔

(۲)

ذی شعور انسان کے آغاز تخلیق ہی سے دین نے انسان کی تعلیم و تہذیب میں دو گونہ خدمت انجام دی ہے۔ اس نے پہلے انسان کو حق و باطل کا ایک تصور اور معیار عطا کیا ہے اور پھر اسے ایسے جذبے سے سرشار کیا ہے کہ وہ جس رستے کو حق سمجھتا ہے، اُسے اختیار کر لیتا ہے۔ حق اور ناحق کے معاملے میں اگرچہ بشری تصورات میں تبدیلی واقع ہوتی رہی ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ انسان حق اور باطل کے مابین امتیازی تصور سے کبھی خالی نہیں رہا۔ ریڈ انڈین اپنے دشمن کی کھوپڑی اتار لینا اخلاقاً صحیح سمجھتا ہے اور ایک نرم دل راہبہ اگر جمعہ کے روز گوشت کھائے

تو وہ ابدی جہنم کے خوف سے کانپتی رہتی ہے۔ ان دونوں کے حق و باطل کے تصورات اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن دونوں بہر حال ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں جب ہیں انہیں جائز اور ناجائز کے درمیان تمیز کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ اس حق و باطل اور جائز و ناجائز کو جانچنے کا معیار ہمیشہ انسان کے دینی تخیلات مہیا کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض فلسفیوں نے اخلاقیات کی بنیاد محض معقولات پر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر بعض لوگوں نے اُس فعل کو اخلاقاً صحیح قرار دیا ہے جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے بیش از بیش مسرت کا باعث ہو بعض دوسرے لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ غیر اخلاقی افعال وہ ہیں جن سے نہ صرف افراد کو ضرر پہنچتا ہے بلکہ ان سے وہ پورا معاشرہ تباہ و برباد ہوتا ہے جس میں ایسے افعال کا عادتاً ارتکاب کیا جائے۔ لیکن اس بات کا اعتراف فلسفے کے ذہین طالب علموں نے بار بار کیا ہے کہ اگر اخلاق کی اساس کسی دینی شعور و ضابطہ پر استوار نہ ہو تو محض منطقی استدلال کی بودی اور ریتلی بنیادوں پر اخلاق کی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ اس لحاظ سے یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ انسان کی فطری ساخت میں دین اور مذہب کا شعور ازل سے پیوست کر دیا گیا ہے اور یہ بعض ایسی حقیقتوں اور سچائیوں پر مبنی ہے جو عالمگیر شرائع کے پیش کرنے والے انبیاء علیہم السلام پر منکشف ہوتی تھیں۔

ڈی ٹاکی وائل DE TOCQUEVILE اپنی مشہور کتاب امریکہ میں جمہوریت میں ایک جگہ لکھتا ہے:

"کوئی انسانی فعل، خواہ وہ کتنا ہی حقیر اور جزئی کیوں نہ ہو، ایسا نہیں ہے جس کا سرچشمہ آغاز ان عمومی تصورات میں نہ پایا جاتا ہو جو انسان اپنے اللہ، اپنے روحانی وجود یا دیگر بنی نوع انسان کے بالمقابل اپنے حقوق و فرائض کے بارے میں رکھتا ہے۔ کوئی امر اس میں مانع نہیں ہے کہ ان سب کا ماخذ اور مبدأ ایک ہی ہو۔ لہٰذا تمام انسانوں کو اس بات سے غایت درجہ کی دلچسپی ہے کہ اللہ، روح، حقوق اللہ اور حقوق العباد

سے متعلق ان کے اعتقادات بالکل واضح اور متعیّن ہوں۔ کیونکہ ان اصولِ اوّلیہ کے معاملے میں شک اور تذبذب ان کے جملہ اعمال کو بخت و اتفاق کے حوالے کر دیگا اور انہیں اختلال اور اضمحلال کا شکار بنا کے رکھ دے گا۔ چنانچہ یہ وہ موضوع ہے جس پر ہم میں سے ہر ایک کے تصورات کا نہایت صاف اور دو ٹوک ہونا انتہائی ضروری ہے، اور پھر دقت یہ ہے کہ اس میں اگر ہر فرد کو اپنی اپنی عقل سے کام لینے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے لیے ان امور کا طے کرنا بھی سخت مشکل ہے۔ ان حقائق کا ادراک کرنا اور ان کی تہ تک پہنچنا صرف ایسے قلوب و اذہان کا کام ہے جو زندگی کے عام تفکرات سے بالاتر ہوں اور جو باریک بینی، جزرسی، بصیرت اور تدبر کے حامل ہوں۔ فی الحقیقت ہم دیکھتے ہیں کہ فلاسفر ابھی تک ارتیاب اور شکوک و شبہات میں گھرے ہوتے ہیں۔ ہر قدم پر عقلی روشنی جو انہیں راستہ سجھاتی ہے، مدھم اور دھندلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اپنی ساری کوششوں کے باوجود ابھی تک وہ چند ایسے متصادم اور متناقض نظریات وضع کر سکے ہیں جن کی پیروی میں ہزاروں سال سے انسانی دماغ بھٹکتے پھر رہے ہیں، بغیر اس کے کہ حقیقت تک رسائی ہو سکے یا خطا کے ارتکاب ہی میں کسی جدت طرازی سے کام لیا جاتے۔ اس نوعیت کا مطالعۂ کائنات ایک عام آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اور اگر انسانوں کی اکثریت اس قسم کے مشاغل کی اہل ہو بھی سہی، تب بھی انہیں سرانجام دینے کی فراغت ہر شخص کو حاصل نہیں ہے۔"

مصنف مذکور خالقِ کائنات اور فطرتِ انسانی سے متعلق قطعی اور متعیّن معتقدات کی ضرورت کو واضح کرنے کے بعد یہ بیان کرتا ہے کہ مذہب اس انسانی ضرورت کو بطریقِ احسن پورا کرتا ہے۔ اس کے الفاظ درجِ ذیل ہیں:

"مذہب کا اوّلین مقصود اور اس کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ وہ عامۃ الناس

کے لیے ان بنیادی سوالات کا ایسا جواب دینا ہے جو بالکل صاف، عام فہم، دو ٹوک اور پائدار ہے۔ بلا شبہ بعض مذاہب باطل اور لغو ہیں، لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے کہ جو مذہب اپنی تعلیمات کو مذکورہ بالا حقائق کے دائرے تک محدود رکھتا ہے اور جو انسان کے دل و دماغ کو چاروں طرف سے محدود و مسدود نہیں کر دیتا وہ درحقیقت ذہنی قویٰ کے لیے ایک منفعت بخش بندش کا کام دیتا ہے، اور اس امر کا اعتراف ناگزیر ہے کہ ہر مذہبی ضابطہ خواہ وہ دوسری دنیا میں باعث نجات ہو، یا نہ ہو لیکن کم از کم اس دنیا میں تو وہ ہمیں عظمت و مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔"

"جو لوگ "آزاد دنیا" میں آباد ہیں، ان کے معاملے میں یہ بات خاص طور پر صحیح ہے۔ جب ایک قوم کا مذہب تباہ ہو جاتا ہے تو اس کی اعلیٰ فکری صلاحیتیں تشکیک و تذبذب کی زد میں آجاتی ہیں اور قوت کارکردگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کا ہر فرد اپنے اور دیگر افراد سے تعلق رکھنے والے اہم مسائل کے بارے میں صرف پراگندہ اور تغیر پذیر خیالات اپنے ذہن میں رکھتا ہے اس کی آرا بڑی غیر معین سی ہوتی ہیں جنہیں باسانی ترک کیا جا سکتا ہے۔ انسانی تقدیر سے تعلق رکھنے والے مشکل سوالات حل کرنے سے جب وہ مایوس ہو جاتا ہے تو وہ نہایت بے حمیتی کے ساتھ ان کے بارے میں سوچ بچار ترک کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں روح پژمردہ ہو جاتی ہے، عزم و ہمت کے سرچشمے سوکھ جاتے ہیں اور عوام الناس غلامی کے لیے بالکل تیار ہو جاتے ہیں۔"

یہی فوائد ہیں جو دینی طرزِ حیات سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں ذہن کی بہت سی بے کار اور لاطائل داخلی الجھنوں میں مبتلا ہونے سے نجات بخشتا ہے۔ ایک اجنبی کائنات کے اندر ہمیں یہ احساسِ یگانگت بخشتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کے بہت سے کھردرے اور ناموس پہلوؤں کو نرم کر کے

ہماری طاقتوں کو کفایت شعاری کے ساتھ صرف کرتا ہے۔

(۳)

دین کی حقانی تعلیمات ہمیں ایک اعلیٰ ذریعہ اور ماخذ سے حاصل ہوتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جنہوں نے دینی طرزِ فکر و حیات کی بنا رکھی ہے، انہوں نے وحی کی وساطت سے پیغامِ الٰہی وصول کر کے اسے انسانوں تک پہنچایا ہے۔ یہ کام انہوں نے ادراک و شعور کی ایک ایسی سطح پر فائز ہو کر کیا ہے، جس تک پہنچنا اور جس کا مشاہدہ کرنا براہ راست ہمارے لیے محال ہے۔ پیغامِ رسالت پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس بات پر یقین کامل رکھیں کہ یہ ایک نادر اور غیر معمولی ذریعۂ علم ہے جو عام بشری احساس و شعور سے ماوراء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ نظریات اور دینی تعلیمات کا باہم موازنہ و مقابلہ غیر ممکن اور بے معنی ہے۔ عام انسانی علم عارضی ہے جس میں نئے تجربات و انکشافات کے با[عث] ہر آن ترمیم و تغیر ہو سکتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات ایک بالکل ہی دوسری بنیاد پر استوار کی گئی ہیں جس میں آئے دن تبدیلی کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ آیئے دیکھیں کہ امام غزالی اپنی مشہور تصنیف "المنقذ من الضلال" میں اس موضوع پر کیا ارشاد فرماتے ہیں:

"ایمان بالرسالت کے باوجود جو لوگ دینی احکام کو فلسفیانہ اصول و نظریات کی سطح پر رکھتے ہیں، وہ درحقیقت رسالت کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک نبی کی حیثیت ایک مردِ دانا سے زیادہ کی نہیں ہے جسے ایک بالاتر ہستی نے رہنما مقرر کیا ہے۔ اس سے منصب نبوت کا استخفاف لازم آتا ہے۔ ایمان بالرسالت کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے علم و حواس سے بالاتر ایک دوسرا عالم ایسا موجود ہے جس سے تعلق رکھنے والوں پر ایسے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے جن کا عام عقل انسانی براہِ راست ادراک نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کان ان اشیاء کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، جنہیں آنکھ دیکھ سکتی ہے اور ذہنی تخیلات حواسِ خمسہ کے ادراک میں نہیں آ سکتے۔"

غرض صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف عقل انسانی اپنی ضعیف قوتِ مشاہدہ کے بل پر کلی نظم کائنات کا احاطہ نہیں کر سکتی اور کاروبارِ حیات کو کامیابی سے چلانے کے لیے انسان کی خاطر کوئی ضابطۂ عمل وضع نہیں کر سکتی۔ لیکن دوسری طرف اس معاملے میں کسی اہل تر اور مجاز شخصیت کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے جو ان معاملات میں ذمہ دارانہ کلام کر سکتا ہو۔ چنانچہ بنی نوع انسان نے بار بار احسان مندی کے ساتھ ان بزرگوں کی طرف رجوع کیا ہے جنہوں نے وحی کی بنا پر انسان کے ماضی و مستقبل کے بارے میں علمِ حقیقت کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے سے انسان کی نجات کا راستہ پیدا کیا ہے۔ علمِ جدید کی مدد سے قدرتی طاقتوں کو مسخر کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ کہنا غلط ہو گا کہ جو حقیقت پردے کے پیچھے مستور ہے، اس کے رازہائے سربستہ کو منکشف کر دیا گیا ہے۔ جدید یورپ کا مردِ حکیم اور سوئٹزرلینڈ کا مشہور ماہرِ نفسیات شخصی جی جنگ اسی سال کی پختہ عمر میں اپنی سوانحِ عمری شائع شدہ ۱۹۶۲ء (MEMORIES, DREAMS, REFLECTIONS)

"خواب و خیال اور یاد ایام" میں یوں رقمطراز ہے:

"میرے لیے اس بات کا تعین ناممکن ہے کہ کیا چیز آخر کار قدر و قیمت کی حامل ہے اور کیا نہیں ہے۔ میں اپنے آپ اور اپنی زندگی کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ مجھے کسی شے کا یقین حاصل نہیں ہے۔ میرے فی الحقیقت کسی معاملے میں پختہ اور واضح معتقدات نہیں ہیں۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں پیدا ہوا تھا اور زندہ ہوں اور مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ "میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں"۔ میرا وجود کسی ایسی دوسری بنا پر مبنی ہے جسے میں نہیں جانتا"۔

اسرارِ حقیقی کے بالمقابل انسان کی یہی بے بسی اور بے چارگی ہے، جس سے نکالنے کے لیے دین کی آفاقی دعوت کی صدا اس کے کانوں تک پہنچتی ہے اور اسے نسلِ انسانی کے نجات دہندگان انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔ انسان یہ دیکھتا ہے کہ اس کا وجود مقید و محدود ہے اور وہ موت کے پنجے سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ موت کا

تیقن، دائمی کشمکش، اور غم والم اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس عقدۂ حیات کو حل کرے جو مجرد عقل و فکر کی زد میں نہیں ہے۔ انسان جیسے جیسے زندگی کا سفر طے کرتا ہے، اُس کے قویٰ مضمحل ہوتے چلے جاتے ہیں، موت کی منزل اُسے قریب تر نظر آتے لگتی ہے اور وہ اس وسیع کائنات میں اپنے آپ کو تنہا، ضعیف اور بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس وقت فکر و تخیل کی ساری جولانیاں ایک غیر حقیقی سراب معلوم ہوتی ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ وحی قرآنی پر کان دھرنے کیلئے انسان آمادہ ہو جاتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ۔ (الملک: ۱-۲)

برکت والی ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں بہتر ہے اور وہ زبردست اور بخشنے والا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ۔ (ابراہیم: ۳)

وہ لوگ جو زیادہ پسند کرتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت سے اور روکتے ہیں اللہ کے رستے سے اور اس میں کجی چاہتے ہیں، یہی دور کی گمراہی میں ہیں۔

قرآن مجید رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے متبعین کا مشن ایسے الفاظ میں بیان فرماتا ہے جن سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۰۹)

تم ایک بہترین امت ہو جو نکالی گئی ہے سب لوگوں کے لیے تم حکم دیتے ہو بھلائی کا اور روکتے ہو برائی سے۔

دینِ اسلام ایک عملی ضابطۂ حیات ہے جو انسان کو اپنے مستقبل سے آگاہ کرتا ہے اور

اُسے دانائی اور پاکیزگی سکھاتا ہے۔ یہ آدمی کو تلقین کرتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور خیر و صلاح کے راستے کی پابندی کریں۔ اسلام اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ نیکی کا اتباع کریں، اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلنے سے باز رہیں اور باطل کی طاقتوں سے مغلوب نہ ہونے پائیں۔

اسلام نے انسان کے سامنے جو معیارِ کمال رکھا ہے اس پر عمومی لحاظ سے دو زاویہ ہائے نظر سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔ انفرادی نقطۂ نظر سے اس معیار کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان "متقی" بن جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہر شخص کے اندر ضبطِ نفس کا مادہ پیدا ہو جائے۔ ایک فرد کی شخصی زندگی میں قانون کا منشا یہ ہے کہ اُسے اپنی ذات پر پُورا قابو حاصل ہو جائے۔ آدمی کا یہ حال نہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر ایسے ولولے اور وسوسے کے سامنے سپر ڈال دے جو کبھی عارضی طور پر طاری ہو جائے بلکہ اُسے اپنی طبیعت پر پُورا کنٹرول ہونا چاہیے۔ آدمی کو ہر وقت چوکنا اور بیدار ہونا چاہیے اور اُسے اپنے رب کی مرضیات کی تکمیل کے لیے دل و جان سے آمادہ رہنا چاہیے۔ جہاں تک اجتماعی معاشرے کا تعلق ہے، خواہ وہ ایک گروہ ہو، ایک قوم ہو، ریاست ہو یا پُوری بنی نوع انسان ہو، اس میں مسلمان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ انسانی وحدت اور یکتائی کے لیے کوشش کرے اور اُن تمام منافشات و تنازعات کو ختم کرنے کی جد و جہد کرے جو انسان کو انسان سے پھاڑتے ہیں اور لڑائی جھگڑے کو جنم دیتے ہیں۔ اسلام ان تمام امتیازات کو بے وقعت سمجھتا ہے جو نسلی اور لسانی بنیاد پر یا محض دولت و اقتدار کے بل پر قائم ہوتے ہیں۔ اس کے بجائے اسلام انسانوں کو ایک ایسے روحانی اور ایمانی رشتے میں پروتا ہے جو پُوری انسانیت کو باہم گرپیوست کر دیتا ہے اور ان کے مابین ایک دائمی وحدت پیدا کرتا ہے۔

آئندہ کے صفحات میں مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی تکمیل کے انہی دونوں پہلوؤں کے بارے میں چند ملاحظات پیش کیے جائیں گے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام فرد اور معاشرے

کی تنظیمِ حیات کے ضمن میں جو فیصلہ کن فریضہ انجام دے سکتا ہے، اسے سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۴)

جہاں تک تکمیلِ ذات کا تعلق ہے، اسلام سب سے پہلے ایک ایک فرد کی سیرت کو تزکیۂ نفس کے ذریعے سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں اصلاحِ خلق کا مسئلہ بنیادی طور پر اصلاحِ ذات ہی سے وابستہ ہے۔ مسلم معاشرہ انجامِ کار متقی اور خدا ترس مسلم افراد ہی سے ترکیب پاتا ہے۔ جس طرح ایک حیاتیاتی جسد کی صحت کا انحصار بہت بڑی حد تک ان انفرادی خلیات کی صحت پر ہے، جن سے وہ جسد مرکب ہے، اسی طرح نوعِ انسان کی صحت و قوت کا پیمانہ اسلام کے نزدیک ان افراد (ذکور و اناث) کی اخلاقی و روحانی صحت و توانائی ہے جن پر وہ نوع مشتمل ہے۔

تکمیلِ ذات کا نظریاتی پس منظر اُن دو اعلانات میں صاف نظر آجاتا ہے جن کا مطالبہ ہر اُس شخص سے کیا جاتا ہے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو۔ پہلا اعلان ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں)، دوسرا ہے: محمد رسول اللہ (محمد اللہ کے رسول ہیں)۔ یہ دوگونہ اعلان و اقرار ہر مسلمان پر لازم و واجب ہے۔ اسلام میں اسے کلمۂ شہادت کا نام دیا گیا ہے، جس کے لغوی معنی تصدیقی اور شہادتی بیان کے ہیں گویا کہ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کی حقانیت پر ہم گواہی دیتے ہیں۔ اس طرح ایک مسلمان توحید کا مسلسل اقرار کرتا رہتا ہے اور چونکہ اس علمِ توحید کا ذریعہ اور واسطہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے توحید کے ساتھ ساتھ آنحضورؐ کی رسالت کا اعلان بھی لازم ہے۔ یہ اثباتِ توحید کوئی ایسا استنباط و استنتاج نہیں ہے جسے محض ذہنی کاوش کے بل پر پیش کیا جاسکے۔ کیونکہ ذہن خواہ کتنا ہی رسا کیوں نہ ہو وہ اس طرح کا نتیجہ اخذ کرنے کا اہل نہیں ہے۔ آدمی اس کرۂ ارضی پر محض چند لمحات کے لیے وجود میں آتا ہے اور جو کچھ اس کے گرد و پیش میں جلوہ گر ہوتا ہے، وہ اس کی اطلاع محض حواس کے واسطے سے پاتا ہے جو بجائے خود محدود ہیں۔ زمان و مکان نہ صرف ہمارے حواس سے ماورا ہیں، بلکہ وہ کسی منطقی

استدلال کی گرفت میں بھی نہیں آسکتے۔ جیسا کہ کانٹ نے اطمینان بخش دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے، چونکہ وہ انسانی علم کے لیے شرائط و وسائط کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے وہ ہمارے علم کے احاطے میں نہیں آسکتے۔ اسی طرح ماضی کی معلومات کے لیے ہمارا عام ذریعہ یا تو مؤرخوں کے بیانات ہیں جو دستیاب شہادتوں پر مبنی ہو سکتے ہیں یا آثارِ قدیمہ سے متعلق وہ تحقیقات و انکشافات ہیں جو ہمارے لیے ممکن الحصول ہیں۔ لیکن انسان میں فکری تجزیے کی طاقتیں خواہ کتنی ہی عمیق اور فیصلہ کن کیوں نہ ہوں، وہ کسی عقلی استدلال کے ساتھ زندگی کی وحدت کو پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچا سکتا اور نہ کسی ایسے اصولِ مشترک کا ادراک کر سکتا ہے جو نہ صرف نسلاً بعد نسلٍ زندگی کی چند اشکال میں رابطہ تلاش کر سکے، بلکہ ایک ہی وقت اور زمانے میں پوری کائنات کے اندر جو مظاہرِ حیات پھیلے ہوتے ہوں، ان میں باہمی تعلق کا بھی سراغ لگا سکے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو توحیدِ الٰہ ایک ایسی سچائی ہے جس تک رسائی محض وحی رسالت پر ایمان بالغیب لانے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

وحیٔ قرآنی ہمیں بتاتی ہے کہ:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ	کہہ دو وہ اللہ ایک ہے
وَ اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ	اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہے
هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ	وہی ذات ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن کا اثبات محض تجرباتی طریق پر نہیں ہو سکتا اور نہ عام انسانی شعور کے بل پر ان کا ادراک ہو سکتا ہے۔ محض ایک رسول کے حوالے ہی سے ان پر ایمان لایا جا سکتا ہے۔

کلمۂ شہادتین کا شمار اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہے اور یہ دونوں شہادتیں بہت بڑی افادیت کی حامل ہیں۔ یہ انسان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کراتی ہیں، جو ان میں مضمر ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام اختلافات و تنازعات کے باوجود، جنہوں نے انسان کو اقوام و طبقات میں منقسم کر رکھا ہے، بنیادی طور پر پوری انسانیت ایک وحدت اور اکائی ہے اور ایک انسان کے سامنے اعلیٰ ترین نصب العین اور مطمحِ نظر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ پوری نسلِ انسانی کو رشتۂ وحدت

میں منسلک کردے۔

روزے کی عبادت کی شکل میں تقویٰ یعنی ضبط نفس اپنی معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔اس مہینے میں ایک مجازی رنگ ہی میں سہی، انسان اپنے ایک روحانی وجود ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ساری زندگی اور بالخصوص اس مہینے میں اپنے اندر یہ احساس بیدار کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ محض کھانا پینا اور نفسانی خواہشات کو پورا کرنا مقصودِ حیات نہیں ہے۔ یہ نفسانی خواہشات تو محض بقائے نفس اور بقائے نوع کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان سے بالاتر ایک عالمِ روحانی بھی موجود ہے، جس میں انسان داخل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے اندر اللہ کے لیے عبودیت اور محبت کے جذبۂ خوابیدہ کو جگانے کے سامان فراہم کرے۔

انسان بالعموم نیکی کے قوانین کا اتباع اس لیے نہیں کرتا، کہ اس کی حیوانی جبلتیں جو اس کے اندر مضمر ہیں، اس پر غالب آجاتی ہیں۔ اور وہ اس کی زندگی میں محکوم رہنے کے بجائے اس پر حاکم بن جاتی ہیں۔ روزہ کم از کم کچھ مدت کے لیے اس حیوانی غلبے کو منقطع کر دیتا ہے اور اس طرح انسان کے اندر اُس ملکوتی صفت کو نشوونما دیتا ہے جو اپنے اُس رب اور خالق سے محبت کا دم بھرتی ہے جس نے اُسے زندگی اور اُس کے جملہ انعامات عطا کیے ہیں۔

رمضان کے خاتمے پر بطور شکرانہ عید الفطر منائی جاتی ہے جو ایک مسلمان کی سالانہ زندگی کا سب سے اہم دن ہے۔ روزے کے ماہانہ تربیتی ضابطے کی پابندی کے بعد مسلمان اپنی بستی کی نماز عید میں شریک ہوتا ہے اور اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنے نفس پر قابو پا سکا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اس زمانے میں بے سمجھ لوگوں کے نزدیک عید کا یہ دن محض رنگ رلیاں منانے کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ گویا کہ یہ دن اپنے ساتھ بدمستیوں اور بداعمالیوں کے لیے ایک عام لائسنس لے آتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ دن ایسا ہے، جس دن رمضان کی غیر معمولی بندشوں کو ڈھیلا کر دیا جاتا ہے اور مسلمان کو اپنے مشاغل میں نسبتۃً آزاد کر دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ روزے کی تربیت سے فائدہ اٹھا کر

نیکی کی جانب زیادہ راغب اور برائی سے زیادہ مجتنب ہو گا۔ روزے کا اصل مقصد یہ ہے کہ زندگی کے طرز عمل میں ایک باطنی انقلاب رونما ہو جائے اور انسان کے اخلاقی نقطۂ نظر میں ایک دائمی اور مستقل تغیر پیدا ہو جائے۔ روزے کے نتیجے میں جو اخلاقی و روحانی ثمرات ایک مومن کو حاصل ہوتے ہیں، انہی کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے لیے اور انہی پر اپنے رب کا شکرانہ ادا کرنے کے لیے وہ نماز عید میں شامل ہوتا ہے۔

(۵)

اس میں شک نہیں کہ انسانی اخوت کے اجتماعی نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے اسلام کا اولین پروگرام نماز با جماعت ہے، لیکن اس کا عظیم ترین مظاہرہ ہر سال حج کے موقع پر ہوتا ہے، جبکہ تمام مسلمانانِ عالم ساری دنیا سے کھچ کر اور سمٹ کر مکہ معظمہ میں جمع ہوتے ہیں اور خدا کے گھر خانۂ کعبہ کے گرد کفن نما احرام باندھ کر اور تمام مصنوعی دنیوی نشانات و امتیازات سے مبرا ہو کر اکٹھے طواف کرتے ہیں۔ محلے کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت اور قدر و قیمت محتاجِ بیان نہیں ہے۔ نماز اگرچہ گھر میں یا دوسری جگہ بھی پڑھی جا سکتی ہے لیکن نماز اور بالخصوص نماز جمعہ کا مسجد میں با جماعت ادا کرنا نہایت ضروری اور موکد ہے۔ یہ مسلمانوں کی اجتماع گاہ ہے۔ مسجد کے لغوی معنی سجدہ کی جگہ کے ہیں۔ لیکن اجتماعی عبادت کی عظمت و شان سب سے زیادہ حج کے موقع پر نمایاں ہوتی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں ہر سال دنیا کے مختلف گوشوں سے چل کر مسلمان بیت اللہ کا قصد کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مختلف قوموں کے افراد ہوتے ہیں، لیکن اس مقام پر وہ ایک ہی انسانی برادری کے ارکان ہونے کی حیثیت میں اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہ ایک ہی خدا کے عاجز بندے ہیں جن کو محض دینی اور ایمانی رشتے نے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس تعلق نے انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا ہے۔

اخوتِ بشریہ کے قیام کے لیے اسلام نے جو انقلاب برپا کیا ہے، اس کی اہمیت کو ابھی تک پورے طور پر سمجھا نہیں جا سکا۔ اسلام کے ماسوا انسانیت کی تنظیم کے لیے دو عناصر سے کام

لیا گیا ہے۔ ان میں ایک خون کا رشتہ ہے اور دوسرا جغرافیائی اور مادی اتصال ہے جو زمین کے باشندوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ ایک قبیلے کے افراد کی رگوں میں مشترک خون کا گردش کرنا یا ان کا ایک ہی خطہ زمین میں بسنا، بس یہی وہ عوامل تھے جن کے بل پر مردوں اور عورتوں کو ایک منظم معاشرے کا جزو بنایا جاتا تھا۔ اجتماعی گروہ بندی کے لیے اسی نسلی یا مادی اتصال پر انحصار کیا جاتا تھا۔ اس نقطہ نظر کی تنگی اور محدودیت کا اندازہ صرف ایک حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تنظیم میں ان عوامل سے اپیل کی جاتی تھی اور وہی اس کی رکنیت کو پیشگی طے کر دیتے تھے جن کا انسانی فطرت کی ان اخلاقی صفات سے کوئی تعلق نہ تھا جو انسان کو حیوان سے ممیّز کرتی ہیں۔ خاک و خون کے رشتے تو حیوانات کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر سکتے ہیں۔ انسان کو انسان سے پیوستہ کرنے کے لیے تو کوئی قلبی اور روحانی رشتہ ہونا چاہیے اور یہی وہ رشتہ ہے جس پر اسلام نے زور دیا ہے۔ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ انسانیت کو ایک ہی سلکِ تنظیم میں منسلک کرنے کے لیے ایمانی رشتہ درکار ہے اور اسی کے ذریعے سے تمام انسان ایک ہی لڑی میں پروئے جا سکتے ہیں۔ اسلام نے مادی علائق کے بجائے معنوی اور اعتقادی رشتے کو رابطے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور غیر مبہم طریق پر اعلان کر دیا ہے کہ عرب کو غیر عرب پر کوئی فضیلت نہیں اور خدا کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ اور ضبطِ نفس ہے۔ اسلام اس نقطہ نظر کو قبول نہیں کرتا کہ مختلف نسلی، جغرافیائی یا قومی امتیازات کی بنا پر انسانوں میں کوئی خاص فرق واقع ہوتا ہے، بلکہ نہایت واضح الفاظ میں یہ بیان کرتا ہے کہ یہ محض ایک ذریعہ تعارف ہیں۔

اسلام میں انسانیت کے جوہر اور اس کے عزو شرف کا معیار بالکل دوسرا ہے اور اسی امتیازی وصف کی بنا پر ایک انسان اور دوسرے انسان کے مابین مواخات و مواسات کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اسلام کے ہجرتِ عامہ کے حکم نے تاریخِ انسانی میں نسلی، لسانی اور قومی گروہ بندیوں سے بالاتر ایک نرالا تصوّر یگانگت پیش کیا ہے۔ اسلام میں انسانیت کا تخیل یہ ہے کہ یہ ایک قافلہ یا کارواں ہے جس کی مختلف ٹولیاں اس احساس اور جذبے کے تحت رواں دواں ہونی چاہییں کہ ہم سب خدا ہی کے لیے ہیں اسی کی طرف پلٹ کر جا رہے ہیں اور ہم ایک ہی منظم اور مربوط برادری کے افراد ہیں۔

مَیں نے ایک عمومی انداز میں انفرادی کمال اور اجتماعی استحکام سے متعلق اسلامی نصب العین کے مضمرات کو بیان کر دیا ہے جو انسانیت کو ایک وحدت میں تبدیل کر کے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اب میں ایک ایسے مسئلے کی جانب متوجہ ہونگا جو دنیا کے سوچنے سمجھنے والے ہر مرد و عورت کے ذہن پر حاوی ہے اور اس کا کوئی حل تلاش کیے بغیر تیسری عالمگیر جنگ کے عذاب سے آدمیت کو بچانا محال ہے۔

(۶)

جس مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اس وقت کی دنیا میں ایک طرف آمریت اور مطلق العنانی کے علمبردار اور دوسری طرف فرد کی آزادی کے نقیب جو متقابل دعوے اور نظریات پیش کر رہے ہیں ان کے مابین محاکمہ اور تصفیہ کس طرح کیا جائے؟ ان دعاوی کی پشت پر جو فکری و نظری اختلافات کام کر رہے ہیں وہ ان سیاسی اور معاشی نظاموں میں صاف دکھائی دیتے ہیں جو "آزادی پسند" اور "کلیت پسند" معاشروں میں آج کل رائج ہیں۔ کلیت پسند ریاستیں کلی اقتدار و تصرف کی مدعی ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کی زندگی غیر اہم اور غیر حقیقی ہے اور اس کے بالمقابل ریاست کی زندگی کو زیادہ حقیقی اور قیمتی فرض کیا جاتا ہے۔

مارکسی نظریئے کے مطابق کلیت پوری انسانی تاریخ کی مادی نقطۂ نظر سے تعبیر کرتی ہے۔ مارکسی طرزِ فکر کے مطابق وہ فیصلہ کُن عوامل جو انسان، اس کے شعور، تخیلات، اس کی صلاحیتوں، تمناؤں اور خدشات کی تخلیق کرتے ہیں وہ محض اُس خارجی دنیا کا ردِ عمل ہیں، جس میں وہ جیتا، چلتا پھرتا اور تعلقات قائم کرتا ہے۔ کارل مارکس نے اس ضمن میں اپنی کتاب "پولیٹیکل اکانومی پر تنقیدی اضافہ" - CONTRIBNT-ION-TO-CRITIQUE OF POLITICAL ECONOMY - میں جو کچھ لکھا ہے وہ درجِ ذیل ہے:

"انسان معاشرے میں مختلف اقسام کی پیداوار کو وجود میں لانے کے لیے دوسروں سے اس طرح کے روابط قائم کرتا ہے جو ناگزیر ہوتے ہیں اور جن میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ روابط مادی قوتِ پیدائش کے ایک خاص ارتقائی مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پیدائش

اشیاء پر مبنی ان روابط کا مجموعہ ہی معاشرے کی اقتصادی ہیئت کو تشکیل کرتا ہے اور یہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس پر قانون و سیاست کی بالائی منزلیں تعمیر ہوتی ہیں اور جن کے مطابق اجتماعی شعور مخصوص سانچوں میں ڈھلتا ہے۔"

کارل مارکس کی ایک بعد کی وضاحت اور تعبیر کے مطابق اجتماعی شعور کی یہ "متعین شکلیں" وہ نظامہائے فکر و تخیل ہیں جو انسان کے لیے اجتماعیت کی حقیقت کے ادراک کا باعث بنتی ہیں۔" گویا کہ مارکسی طرزِ فکر کے مطابق انسان ایک ڈرامے کے بے بس تماشائی کا کردار ادا کرتے ہیں جس کا انجام پہلے سے طے شدہ ہے اور جس میں انسان زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس جدلی عمل کی رفتار کو ذرا تیز کر دیں جو "حقیقتِ اجتماعیہ" کو غیر طبقاتی سوسائٹی کے آخری مرحلے تک پہنچانے کے لیے بہرحال جاری ہے۔ بلکہ تاریخ کی مارکسی اور معاشی تعبیر کے مطابق یہ کہنا بھی ممکن نہیں ہے کہ انسان اس عمل کو "تیز تر" کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذہنی محرک جو حالات کی رفتار بڑھانے پر آمادہ کر سکتا ہے، بجائے خود اس کے بارے میں بھی یہی فرض کرنا پڑے گا کہ وہ محض ایک سطحی علامت ہے جو معاشرے میں موجود معاشی عوامل کی عکاسی کرتی ہے۔ مارکس کے نزدیک خیالات بھی مادی اشیاء کی پرچھائیں ہیں۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے:

"مادی زندگی میں پیداآوری کے طریقے زندگی کے معاشرتی، سیاسی اور روحانی ادارات کی صورت گری کرتے ہیں۔ انسان کے احساسات سے اس کی زندگی ترتیب نہیں پاتی، بلکہ اس کے برعکس انسان کا سماجی ماحول اس کے احساس و شعور کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے۔"

جوزف سٹالن نے مارکس کے فلسفے کی جو تفسیر پیش کی ہے اُس میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے:

"مارکس کے پیروؤں کی مادی فلاسفی کے مطابق مادہ، نیچر اور زندگی ایک خارجی حقیقت ہے جو ہمارے ذہن سے باہر ایک مستقل بالذات وجود رکھتی ہے۔ مادے کو اولین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ تمام احساسات، تخیلات اور قلبی

واردات کا اصل ماخذ ہے۔ دماغ کی حیثیت ثانوی اور فروعی ہے کیونکہ یہ محض مادے اور مادّی زندگی کا انعکاس ہے۔ خیالات مادّے کی پیداوار ہیں۔ مادہ ارتقاء کے اعلیٰ منازل طے کر چکنے کے بعد انسانی دماغ کی شکل اختیار کرتا ہے اور دماغ ہی آلہ تخیلات ہے۔

اس فلسفے کی بنیاد پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کی مجموعی زندگی کا مادّی ارتقا اصل اہمیت کا حامل ہے اور چونکہ اس اجتماعیت کا مظہر اقتدار ریاست ہے، اس لیے فرد کو ریاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ فرد کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنا تاریخی فریضہ انجام دینے کے لیے ریاست کے ہاتھ میں محض آلۂ کار بن کر رہے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ امر واضح ہے کہ اس نقطۂ نگاہ کو اختیار کر لینے کے بعد مارکسی فلسفے کے پاس تاریخ کو جانچنے کے لیے تاریخ سے بالاتر کوئی معیار اور مرجع باقی نہیں رہتا۔ یہ طرز فکر ایک طرف انسان سے تاریخ سازی کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتا کہ انسان سوسائٹی کے موجودہ ڈھانچے کو ایک "غیر طبقاتی معاشرے" میں تبدیل کرنے کے لیے آخر کیوں کوشش کرے؟ اس سوال کا جواب مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ یہ ہے کہ مارکسی طرز فکر کا آغاز و انجام اس مفروضے پر ہوتا ہے کہ انسان خود تاریخی عمل کا ایک بے بس غلام ہے۔ مسٹر ڈبلیو ڈیون پورٹ کے بقول اس طرز فکر کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہمیں ایک "جدلی انسان" بنا دیا جائے۔ مصنف مذکور اس ضمن میں مزید یوں رقم طراز ہے:

"یہ جدلی انسان DIALECTICAL MAN ایک طرح سے ریاست کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی ROBBOT ہے۔ وہ ایک جاندار ہے جسے حیوانی سطح پر اتار دیا گیا ہے۔ وہ ایک چیونٹی ہے جو دوسری بہت سی چیونٹیوں کے ساتھ ایک ضابطے میں کسی ہوتی اپنے بل کے اندر رہتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا یہ جدلی تصور نوع انسانی کو ایک غیر انسانی جامے میں پیش کرتا ہے اور آدمیت کی فلاح کا ایک ایسا نقشہ کھینچتا ہے جسے ہم ظلم اور جبر و استبداد کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دے سکتے۔ اس میں گویا انسان

کو الٹا کر کے سر کے بل کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس میں انسانیت اور آدمیت کے
اب تک کے تصور کی بالکل قلب ماہیت ہو گئی ہے اور اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ
دیا گیا ہے۔ ایسا انسان ہماری دنیا کے لیے تباہی اور ہلاکت کا پیغام ہے اور اگر
وہ زمین پہ چھا گئے تو ہمارا تصورِ آدمیت کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

(۷)

جدلی مادیت کے جس فلسفے پر کلیت پسند ریاستوں کی تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرا تصور ہے جو دنیا کے اس حصے کے اقتصادی اور سیاسی ادارات میں کارفرما ہے جسے "آزاد دنیا" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ اور یہ تصور انسانیت کے وقار اور اس کی انفرادی قدر و قیمت پر زور دیتا ہے اور فرد کو ایک مقصود بالذات وجود قرار دیتا ہے۔ اس فلسفے کے علمبرداروں کا کہنا یہ ہے کہ فرد کا ارتقا انسانیت کی ترقی کے لیے شرط لازم ہے اور جو معاشرہ فرد کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتا وہ غیر ترقی یافتہ اور پس ماندہ ہے۔ قانون کی حکمرانی اور اجتماعی اقتدار کا جمہوری قواعد میں پابند ہونا، یہ دو ایسے اصول ہیں جو فرد کو سوسائٹی میں ایک شایانِ شان مقام کی ضمانت دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک آزاد معاشرے میں فرد کی جان، مال اور عزت کے تحفظ کا انتظام کیا جاتا ہے اور قانونی کارروائی کیے بغیر ان حقوق پر دست درازی نہیں کی جاتی۔ گویا کہ فرد کی رضا اور آزادانہ اجازت کے بغیر اس پر کوئی قدغن عائد نہیں کی جاسکتی اور ریاست کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ من مانے طریق پر فرد کے حقوق سلب کر سکے۔ ہیئتِ حاکمہ کا وجود محض اس لیے ہے کہ وہ فرد کو بلا روک ٹوک ترقی کے رستے پر گامزن ہونے دے اور اس راہ کی ساری رکاوٹوں کو دور کرے۔ جو ریاست اور حکومت اس نظریے پر قائم ہو، اس کے بنیادی اصول یہ ہوں گے:

(۱) تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اور پیدائش کے بعد وہ اپنے حقوق کے معاملے میں آزاد ہیں۔ شہری امتیازات کی بنیاد محض افادیتِ عامہ ہے۔

(۲) تمام سیاسی ادارات کا مقصد انسان کے فطری اور غیر متبدل حقوق کا تحفظ ہے۔

انسان کی جان، مال اور عزت و آبرو نہایت محترم ہے اور ظلم و عدوان کے مقابلے کا ہر فرد حق رکھتا ہے۔

(۳) حاکمیت کا مأخذ پوری قوم کے افراد ہیں جب تک پوری قوم واضح طور پر کسی فرد یا مجموعہ افراد کی جانب یہ حاکمیت منتقل نہ کرے۔ وہ فرد یا افراد حکمرانی کا حق نہیں رکھتے۔

(۴) اقتدارِ عامّہ ایک امانت ہے اور جو شخص بھی اس امانت میں غلط طریق پر تصرف کریگا۔ اس سے محاسبہ کیا جاسکے گا۔

(۵) تمام انسان پیدائشی طور پر مساوی ہیں اور اپنے خالق کی طرف سے بعض ناقابلِ سلب حقوق انھیں ودیعت کیے گئے ہیں۔ سب کو زندہ رہنے اور اپنی خوشی کے مشاغل اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ انھی حقوق کی محافظت کی خاطر حکومتیں شہریوں کی آزاد مرضی سے وجود میں لائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی حکومت ان حقوق کے تحفظ میں ناکام رہے یا انہیں پامال کرنے کی کوشش کرے تو عوام کو ایسی حکومت کے بدلنے کا حق پہنچتا ہے اور وہ اس کے بجائے ایسی دوسری حکومت کو وجود میں لاسکتے ہیں، جو ایسے اصولوں پر مبنی ہو اور ایسے طریق پر اختیارات کو استعمال کرے جس سے عوام کی حفاظت و مسرت کے مقاصد زیادہ اچھے اور احسن طریق پر حاصل ہوسکیں۔ (ملاحظہ ہو امریکہ کا اعلانِ آزادی ۱۷۷۶ء)۔

دونوں نقطہ ہائے نظر کو آمنے سامنے رکھنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انفرادی آزادی جو "آزاد دنیا" کا طرۂ امتیاز ہے، وہ مارکسی طرزِ فکر کے مطابق سوسائٹی کے امراض کا مداوا نہیں ہوسکتی یہ ان خرابیوں کو ایک دائمی شکل دے سکتی اور ان میں اضافے کا موجب ہوسکتی ہے۔ جس معاشرے میں عدمِ مساوات موجود ہو، وہاں "مساویانہ قانونی تحفظ" سوسائٹی کی ناانصافیوں کو جاودانی زندگی بخش دے گا۔ مارکس کے فلسفے کے لحاظ سے سماجی ارتقاء صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ریاست کے اقتدار کو مقدس اور بالادست قرار دیا جائے تاکہ وہ ایک انحطاط پذیر سوسائٹی کو غیر طبقاتی سوسائٹی میں تبدیل کرسکے۔

(۸)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سماجی زندگی کو منظم کرنے کے لیے ان دو حریف طرز ہائے فکر کی موجودگی میں اسلام اس مسئلے کا کیا حل پیش کرتا ہے۔

اگر ہم معاشرتی ارتقاء کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک فرد میں ذاتی تشخص کا احساس جس نے ہر انسان کی انفرادیت اور شخصیت کو جنم دیا ہے، یہ احساس ترقی یافتہ معاشرے میں ایک ثانوی پیداوار ہے۔ جو معاشرے تہذیب کے ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں ان میں یہ احساس ناپید ہے، اور ان کے کسی فرد کو معاشرے کے بالمقابل اپنی انفرادیت کا شعور حاصل نہیں ہوتا۔ قدیمی طرز کی سوسائٹی میں جماعتی شعور ہی اصل بنیاد ہوتی ہے جس سے انفرادی شعور ماخوذ اور متفرع ہوتا ہے۔ گروہ بحیثیت گروہ ہی سوچتا، محسوس کرتا اور فیصلے دیتا ہے اور فرد اس اجتماعی عمل کے خلاف نہیں جا سکتا کیونکہ اُسے اپنی خودی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ قدیمی طریق بود و باش رکھنے والا انسان اپنے قبیلے کا ایک جزو لاینفک ہوتے ہوئے اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا فرد نہیں سمجھتا جس کے کچھ ناقابلِ تنسیخ حقوق ہوں بلکہ وہ اپنے آپ کو ایک بڑے مجموعے کا جزوِ غیر ممیز خیال کرتا ہے۔ وہ قبائلی زندگی کے اعتقادی، اقتصادی اور سماجی بندھنوں میں اس طرح سے جکڑا رہتا ہے کہ گروہی زندگی کا احساس اُس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ یونانی تہذیب میں کنبے کو ایک قانونی شخصیت شمار کیا جاتا تھا۔ قدیم ہند، جاپانی اور چینی معاشروں کی تنظیم کا بھی یہی حال تھا۔ ایک مشترک کنبے کا حصہ ہونے کا احساس ان کے افراد میں بالکل قدرتی اور لابدی تھا۔ ان میں آج کل کی طرح انفرادیت کا کوئی احساس موجود نہ تھا۔ کنبے کا اقتدار زبردست اور بالاتر تھا۔ ان کی ضروریات تمام تر خاندانی ضروریات تھیں۔ جاپانی اور چینی معاشرے اب تک اس امر کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ خاندان کے افراد اس حد تک خاندانی زندگی میں گم ہیں کہ ان کی کوئی شخصی یا انفرادی زندگی نہیں ہے جو خاندانی زندگی سے جدا اور قابلِ امتیاز ہو۔ بہر کیف انفرادیت کا احساس تہذیب و تمدن کی علامت ہے۔ یورپ کی تاریخ بھی یہی بتاتی

ہے کہ یورپ میں انفرادیت کا ظہور عیسائیت کے فروغ کے بعد ہوا ہے۔ یہ اس مذہبی تعلیم کا نتیجہ تھا جس نے ہر فرد کو اپنی ذاتی اور انفرادی حیثیت میں اپنے خالق کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیا ہے اور اس کے لیے حیات بعد الممات اور یوم الحساب کا تصور پیش کیا ہے۔ ایک ایک فرد کے اپنے مستقبل کے معاملے میں مختار و مسئول ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ خدائی احکام کی پیروی کا خود آزادانہ انتخاب کرے اور اسی شے نے انسانی فکر و دانش کو نشو و نما دی ہے اور اُسے گرد و پیش کی اُن بے شعور اور اندھی بہری طاقتوں سے نجات بخشی ہے جو اب تک اس کی قسمت کی مالک بنی رہی ہیں۔

تاہم اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ انسان تنہا زندگی بسر نہیں کرتا، بلکہ وہ ایک سماجی عمل کی پیداوار ہے اور جس ماحول میں اس کی پرورش ہوتی ہے اس کے خیالات و احساسات اس ماحول میں کارفرما تہذیبی عوامل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کا جسد خاکی بھی اُسے اپنے والدین سے ورثے میں ملتا ہے، اور اس کے والدین، اساتذہ، اعزہ اور احباب اس کے قلب و روح پر اپنے اثرات کے گہرے نقوش مرتسم کرتے ہیں۔ انسان کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے، ماسوا اُس جد و جہد کے جسے انسان ماحول و میراث سے حاصل شدہ عطیات سے استفادے پر صرف کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو انفرادیت ایک خیالی اور موہوم چیز نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود پھر بھی ایک پہلو ایسا ہے کہ اگر اُس پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی جگہ پر فرد کا بھی اجتماعی شعور کے ارتقاء میں بہت بڑا دخل ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ حق و صداقت کا انکشاف اور شعور ہمیشہ ایک فرد کی ذات ہی کو ہوتا ہے۔ تمام سچائیوں کا آغاز شخص واحد کی اقلیت سے ہوتا ہے۔ اسی نقطۂ آغاز سے آگے چل کر ہر سچائی میں وسعت اور گیرائی پیدا ہوتی ہے، چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ حقانیت کو معاشرے میں قبولِ عام حاصل ہو جاتا ہے۔ زندگی میں تخلیقی و تجدیدی صلاحیت کا سرچشمہ تمام تر فرد کی ذات ہے اگر فرد اور انفرادیت کا احترام موجود نہ ہو تو حق کے طلوع ہونے اور معاشرتی فضا میں اس کے بلند اور تابناک ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اگر کسی معاشرے میں افراد کی انفرادی حیثیت میں توقیر اور عزت

افزائی نہ ہو تو زندگی کے پیش آمدہ مسائل کو وہاں زیادہ دیر تک حل نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ اس بات کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ سماجی ارتقا کے لیے فرد کی تعظیم و تکریم شرط اول ہے۔ اگر فرد کو کلمۂ حق کہنے کی آزادی نہ ہو گی تو سچائی کا ظہور اور غلبہ معاشرے میں کیونکر ممکن ہو گا؟ یہی وجہ ہے کہ حکومتوں کو آئین کا پابند بنا کر ان کے اختیارات کو محدود و معین کیا جاتا ہے تاکہ فرد کی آزادی و خودداری بیجا اور ناروا دست درازیوں سے محفوظ رہے۔ قانون کی حکمرانی اور عمومی اقتدار کو پابندِ جمہوریت بنانا، یہ تمام تدابیر ایسی ہیں جن کا مقصد افراد کے لیے مساوات، حریت اور عزت کا برقرار رکھنا ہے۔ افراد ہی معاشرے کے عناصر ترکیبی ہیں۔ انہی کے لیے حکومتیں تشکیل کی جاتی ہیں اور معاشرے میں نظم و ضبط کو قائم رکھا جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہے کہ فرد اور ریاست دونوں کے مفادات اپنی اپنی جگہ برابر اہم اور قابلِ لحاظ ہیں اور جدید اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام ہائے فکر نے اس معاملے میں انتہائی متضاد نقطۂ نظر پیش کر کے جو دوگونہ مشکل پیدا کر دی ہے، اسے حل کرنے کے لیے ایک معتدل اور بیچ کی راہ نکالنا ضروری ہے۔ اسلام کی شان یہی ہے کہ وہ میانہ روی سکھاتا ہے اور انتہاپسندی سے بچاتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو اللہ نے اُمَّةً وَّسَطًا کا خطاب دیا ہے۔ میرے نزدیک فرد کی تربیت اس طریق پر ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مفادات کو جماعت کی فلاح کے تابع رکھ سکے اور دوسری طرف حکمرانوں کو اپنے اختیارات اس اصول اور عقیدہ کو سامنے رکھ کر استعمال کرنے چاہییں کہ اگر فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اسے محض ریاست کی عظمت و شوکت کے قیام کا آلۂ کار بنا لیا جائے تو فرد کی زندگی ایسی ضابطہ بندی کے شکنجے میں جکڑی جائے گی جس سے اس کی وہ تخلیقی اور اجتہادی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں گی جن سے وہ جماعت کی عمومی فلاح کے لیے کام کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فرد کو چاہیے کہ وہ ریاست کی حقیقت سے آگاہ رہے اور اس کے استحکام و ارتقاء کے لیے کوشاں رہے اور امانت اقتدار جن لوگوں کے سپرد ہے ان کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کریں جن میں فرد کی خودی نشو و نما پا سکے اور وہ حق کی تلقین و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ باہمی اعتماد، ایثار، اور رواداری کی فضا اسی طرح وجود میں آ سکتی ہے۔ سماجی منظر کے دو انتہائی سرے ——— آدمی اور نوعِ آدم، فرد اور ریاست اسی

طریق پر ہم آہنگی کے ساتھ اپنا اپنا کام کر سکتے ہیں۔ آخر یہ فرد ہی تو ہے جو اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ ریاست بحیثیت ریاست کے یا پوری انسانیت بحیثیت ایک نوع کے جواب دہ نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاشرے میں بنیادی طور پر جو شے مطلوب و مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہر فرد کی زندگی سے بھوک، غربت، جہالت اور احتیاج کو رفع کیا جائے اور پھر اُسے مادی سطح سے بلند کر کے اپنے خالق کی عبادت کرنے اور اس کے احکام بجا لانے کے قابل بنایا جائے۔ کہنے کو خواہ کچھ ہی کیا جائے، اس امر سے مجالِ انکار نہیں کہ خاندان، قبیلہ، گروہ، قوم بلکہ پوری نسل انسانیت ایک مصنوعی وجود رکھتی ہے کیونکہ ان ناموں کی کوئی زندہ اور مشخص ہستیاں موجود نہیں ہیں۔ ان کا وجود محض اعتباری ہے اور محض اس حد تک حق بجانب ہے جس حد تک وہ فرد کی ترقی کے بقا و اضافہ کا ضامن ہے۔ اس لیے ان مصنوعی موجودات کے نام پر جن لوگوں کو کام کرنے اور فیصلے نافذ کرنے کا موقع ملتا ہے، انہیں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ان کی اصل ذمہ داری فرد کی نشوونما ہے۔ اسی طرح فرد بھی اپنی جگہ پر تب ہی مستفید ہو سکتا ہے، جبکہ وہ ہیئت اجتماعی کو برقرار رکھنے اور مضبوط بنانے میں ایثار و بے نفسی سے کام لے جس طرح دانہ خاک میں مل کر اور پانی میں ڈوب کر ایک پودے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، پھل پھول دیتا ہے اور آخر کار بیجوں کی ایک فصل وجود میں لاتا ہے۔ اسی طرح فرد جب اپنی خوشی سے اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کرتا ہے اور معاشرے کے دیگر اجزاء مثلاً خاندان، قبیلہ اور قوم کے ساتھ مل جل کر کام کرتا ہے تو اس کی صلاحیتیں پروان چڑھتی اور برگ و بار لاتی ہیں۔ یہی حقیقت ہے جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ

تم بھلائی نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم اُس میں سے خرچ نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔

مسلمان سے اس امر کا مطالبہ ہے کہ وہ رضا کارانہ طور پر انفاق سے کام لے۔ اُسے سورج کی طرح بلا معاوضہ روشنی اور گرمی فراہم کرنی چاہیے۔ زکوٰۃ مسلمان کے اسی طرزِ فکر و عمل کا ایک مظہر ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ فرد جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے قربانی پیش کرے اور اپنے مال سے

دستبردار ہو جاتا ہے۔ انسان کسی شے کا حقیقی مالک نہیں ہے۔ اس لیے جس مال کا دوسرا بہتر مصرف ہو سکتا ہے، اسے روک کر رکھنے کا اُسے حق نہیں ہے۔ جب انسان اپنے مفادات کو تج دیتا ہے اور دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتا ہے، اس وقت انسان فرشتوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔

اوپر میں نے یہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام ایک بہتر اور اعلیٰ تر دنیا کو وجود میں لانے کے لیے کیا طریقِ کار اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نصب العین ہمہ گیر اور غیر محدود ہے۔ اسلام نے جو بلند ترین اخلاق و کردار کے معیارات مقرر کیے ہیں ہم جدوجہد کرتے ہوئے درجہ بدرجہ ان کے قریب تر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن آخری منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم اپنی تمام تر مساعی کے باوجود معیارِ کمال سے فروتر ہی رہیں گے۔ اور اس سے جتنا نیچے ہم ہوں گے۔ اپنی پستی کا احساس ہمیں اتنا ہی زیادہ کوشش پر اُبھارے گا۔ اسلامی مقاصد اور نصب العین کے حصول کے لیے مسلسل کوشش کیے چلا جانا اسی کا نام "جہاد" ہے۔ اس لفظ کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، لیکن اس کے اصل معنی یہی ہیں۔ میں دوبارہ یہی کہوں گا کہ ایک مسلمان کا لگاتار اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد جاری رکھنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاد کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہو سکتی ہیں، اللہ کے احکام و فرامین جن کی تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے فرما دی ہے۔ ان کی ہم جتنی زیادہ مضبوطی کے ساتھ پیروی کریں گے، ہمارا اخلاقی مرتبہ اور وزن اسی تناسب سے بڑھتا چلا جائے گا۔

(۹)

آخر میں میری گزارش یہ ہے کہ ہماری تعلیم گاہوں میں "اسلامیات" کا موضوع اسلام کا کلی نصب العین ہونا چاہیے۔ کامل حق کی تلاش جہادِ اکبر ہے۔ ایک ہی دفعہ جان دے دینا آسان ہے۔ لیکن جاہلیت کے خلاف مسلسل جنگ کرنا۔ اور چھوٹے موٹے قیصروں کے علی الرغم کلمہ حق کا اعلان کرنا میرے نزدیک یہ حبِ الٰہی کا ایک برتر اور بلند تر مظہر ہے۔

اسلامیات کے بارے میں مزید ایک غلط فہمی یہ ہے کہ اسے بعض اوقات محض تفاسیرِ قرآن

انتخابِ حدیث، اور قدیم کتبِ فقہ کے مطالعے تک محدود کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھی صحیح اسلامی نقطۂ نظر نہیں ہے۔ طبیعیات، علم کیمیا، علم الحیات، ریاضی، فلکیات، زراعت، طب، قانون اور تاریخ وغیرہ کا مطالعہ بھی اگر اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے کہ فرد کی زندگی پاکیزہ ہو اور پوری انسانیت کے لیے ذریعۂ اتحاد و ارتباط ثابت ہو، تو یہ مطالعہ بھی اسلامیات ہی کا ایک حصہ ہے۔

اسلامی طرزِ حیات میں دین و دنیا کے مابین کوئی منافات و امتیاز نہیں ہے۔ اسلام میں "قیصر کا حصہ قیصر کو ادا کرنے" کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں قیصر کا کچھ سرے سے ہے ہی نہیں، سب کچھ اللہ کا ہے۔ اسلام قیصریت کا مخالف ہے، کیونکہ قیصر اس راہ میں کاوٹ ہے جس پر چل کر آدمی اپنے خدا تک پہنچتا ہے۔ ہر شکل میں برائی کا مقابلہ جہاد ہے۔ نوعِ انسانی کے شہداء کی تاریخ درحقیقت شر کے خلاف جہاد کی تاریخ ہے۔ جان دینے والوں نے اپنی جانیں اسی لیے دی ہیں کہ سبیل اللہ کے موانع دُور ہوں اور اللہ کے بندے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر اپنی منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کریں۔ قیصر شاہراہِ عام پر ایک سنگِ گراں ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک جاروب کش کی خدمت انجام دے سکتا ہے لیکن اگر وہ خدا کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلائے اور اس طرح خدائی قانون کے خلاف جنگ کرے، تو خدائی قانون کے مطابق اس کا رستے سے ہٹایا جانا مقدر ہو چکا ہے۔ تمام قیاصرہ صفحۂ تاریخ پر حرفِ غلط کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی نوحہ خواں اور گریہ کناں کے بغیر ان کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اسلام اپنے نظام میں قیصر کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ حاکمیت اور بادشاہی اللہ کے لیے ہے وَلِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے۔ اللہ کی ملکیت ہے۔ تمام طاقت و اقتدار اسی کے لیے ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔

اس لیے اسلام کے طالبِ علم کو شعبہ ہائے حیات میں دینی و غیر دینی کی تفریق کا مہلک نظریہ تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ پوری زندگی ایک وحدت ہے اور مشیتِ الٰہی سے وجود میں آئی ہے۔ اس میں ناپاک اجزاء کا کوئی دخل نہیں۔ ایک مسلم اسکالر کو محبت اور گرم جوشی

کے ساتھ اپنے اسلامی نصب العین سے ہمکنار رہنا چاہیے اور الٰہ الحق کی عبادت و عبودیت کے جذبے میں سرشار ہوکر تحصیل علم کا کام کرنا چاہیے۔

اس طریقے سے نہ صرف اس کی انفرادی تکمیل ہوگی بلکہ وہ پوری انسانیت کو ان ابتریوں سے بچالے گا جو خدا کے حقوق اور قیصر کے حقوق کی مصنوعی تفریق کا نتیجہ ہیں۔

وقت کی پکار یہی ہے، حالات کا تقاضا یہی ہے۔ خوش بخت اور خوش نصیب ہیں وہ مردان کار جو اس پکار کو سنیں اور اپنی پیہم جد وجہد کے ذریعے سے اس اعلیٰ و ارفع نصب العین کو حاصل کریں جس کے لیے انسانیت آغاز تخلیق سے اب تک تڑپتی چلی آرہی ہے۔

قواعد التفسیر

امام ابن تیمیہ

رَبِّ یَسِّرْ وَاَعِنْ بِرَحْمَتِکَ ۔ بعض متعلم دوستوں کی خواہش ہے کہ قرآن کو سمجھنے سمجھانے کے لیے اصولی باتیں لکھ دوں جو قواعدِ کلیہ پر حاوی اور معانی کی معرفت میں معین ہوں ۔ کیوں کہ تفسیروں میں رطب و یابس سبھی طرح کی باتیں جمع ہیں ۔ صحیح و سقیم روایتیں اور خوب و زشت روایتیں ، حق کے ساتھ باطل اس طرح گندھا ہوا ہے کہ امتیاز دشوار ہو جاتا ہے ، پھر قرآن کو صحیح اور محفوظ طور پر سمجھنے کا طریقہ کیا ہے ؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ صحیح علم وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محفوظ طریقے پر ثابت ہو ، پھر ایسے آثار و اقوال جن کی دلیل واضح ہو ۔ ان دو اصلوں کے سوا جو کچھ ہے ، کھوٹا ہے ، مغشوش ہے اور قطعاً ناقابلِ قبول ۔

قرآن کو سمجھنا امت کی اساسی ضرورت ہے ۔ وہ خدا کی مضبوط رسی ہے ، ذکرِ حکیم ہے ، صراطِ مستقیم ہے ۔ خواہشیں اس کو مکدر نہیں کر سکتیں ، زبانیں اس کو بگاڑ نہیں سکتیں ، دہرائے جانے سے وہ فرسودہ نہیں ہوتا ۔ اس کے عجائب بے کراں ہیں ۔ علمائے حق ہمیشہ اس کے تشنہ رہے ہیں ، علم و معرفت کے طلبگاروں نے اس سے نو بنو اکتشافات و انکشافات کی نعمتیں پائی ہیں ۔ جو کوئی اس کے منشاء و فحواء کے مطابق کہتا ہے ، قابلِ قبول ہے ۔ جو کوئی اس کو اپنا دستور العمل بناتا ہے ، اجر پاتا ہے ۔ جو کوئی اس کے مطابق حکومت کرتا ہے ، عدل کرتا ہے ۔ جو کوئی اس کی طرف بلاتا ہے ، ہدایت و سعادت کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ جو کوئی سرکشی سے اسے چھوڑ دیتا ہے اپنے آپ کو ہلاکتوں میں ڈال دیتا ہے ۔ اور جو کوئی اس سے روگردانی کر کے رشد و ہدایت چاہتا ہے

اپنے آپ کو گمراہیوں میں مبتلا کر لیتا ہے ۔ ارشاد باری ہے:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ (طٰہٰ: آیت ۱۲۶)

پس اگر پہنچے تم کو میری طرف سے ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی نہ تو وہ بھٹکے گا اور نہ بدبخت ہوگا، اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کا جینا تنگی بے کلی کا جینا ہوگا۔ اور وہ اٹھایا جائے گا قیامت کے دن اندھا کہے گا، پروردگار! کیوں اٹھایا تو نے مجھ کو اندھا؟ دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا؟ ارشاد ہوگا: یونہی تو نے ہماری آیتوں کو جب وہ تجھے پہنچیں بھلا دیا تھا اسی طرح ہم نے تجھ کو بھلا دیا۔

اور فرمایا:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (المائدہ: ۱۶)

بے شک آئی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب بیان کر دینے والی جس سے راہ دکھاتا ہے اللہ رضائے حق کے طالبوں کو سلامتی کی راہیں، اور نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف اپنے اذن سے ۔ اور چلاتا ہے ان کو سیدھی راہ پر۔

اور فرمایا:

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ اللّٰهِ

یہ کتاب ہم نے اتاری ہے تیری طرف تاکہ برآمد کرے لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف ان کے پروردگار کے اذن سے، غالب ارجمند

الَّذِی لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط (ابراہیم ۱:۱)	سراپا حمد اللہ کے محفوظ رستے کی طرف، اسی کا ہے سب کچھ جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے

اور فرمایا:

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ o صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ۔ (الشوریٰ ۴۲:۵۲-۵۳)	اور اسی طرح بھیجی ہم نے تیری طرف ایک روح اپنے امر سے۔ نہیں جانتا تھا تو کیا ہے کتاب اور کیا ہے ایمان لیکن ہم نے بنا دیا اس کو نور۔ ہدایت کرتے ہیں ہم اس کے ذریعے جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے۔ اور بے شک تو البتہ ہدایت کرتا ہے سیدھی راہ کی طرف۔ راہ اللہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ خبردار، اللہ ہی کی طرف ہے بازگشت تمام امور کی۔

اب میں توفیقِ الٰہی سے، جو کچھ اس بارے میں ذہن میں محفوظ ہے، سپردِ قلم کرتا ہوں، وَاللّٰہُ الھادی الیٰ سبیل الرشاد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو قرآن کے الفاظ اور معانی و مطالب ایک ساتھ تعلیم فرماتے، دلیل اس کی یہ آیت ہے:

لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ (النحل ۱۶:۴۴)	تاکہ پوری وضاحت سے بتا دے لوگوں کو جو کچھ نازل کیا گیا ہے ان کی طرف۔

ابوعبدالرحمٰن سلمی (متوفی ۷۳ھ) کہتے ہیں: وہ اصحاب جنھوں نے ہمیں قرآن سکھایا: عثمان بن عفانؓ (علی بن ابی طالب)، عبداللہ بن مسعود، رضی اللہ تعالیٰ علیہم کہا کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم قرآن کی دس آیتیں سیکھتے اور جب تک ان سے متعلق تمام باتیں نہ جان لیتے، اور علم کے ساتھ عمل جمع نہ کر لیتے، آگے نہیں بڑھتے تھے۔ یوں ہم نے قرآن اور اس کا علم اور اس پر

عمل، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک ساتھ سیکھا۔ اسی وجہ سے ان بزرگوں کو ایک ایک سورہ کو سیکھنے میں مدتیں لگ جاتی تھیں۔ امام احمدؒ اپنی مُسند میں انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول لائے ہیں کہ ہم میں سے کوئی سورۂ بقرہ اور آل عمران یاد کر لیتا تو وہ لوگوں کی نگاہوں میں بزرگ بن جاتا تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سورۂ بقرہ کئی برس میں، بروایت امام مالکؒ آٹھ برس میں یاد کی تھی۔

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو قرآن کے حفظ و ضبط میں یہ اہتمام اس بنا پر تھا کہ ارشاد باری ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ۔ (ص: ۲۹)
یہ کتاب کہ ہم نے اتاری ہے تیری طرف برکت کی اس لیے کہ لوگ سوچ سمجھ کر اس کی آیتوں پر عمل پیرا ہوں

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (محمد: ۲۴)
کیا پھر نہیں سوچ سمجھ سے کام لیتے قرآن میں

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ (مومنون: ۶۸)
کیا پھر نہیں سوچ وچار کیا انھوں نے اس کھری محکم بات میں۔

اور ظاہر ہے فہم و تدبر، معنی پر آگاہی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (یوسف: ۲)
تحقیق ہم نے اتارا اس کو صاف سلیس واشگاف زبان میں، تاکہ تم سمجھ لو۔

اور عقل میں کوئی بات تبھی آسکتی ہے کہ جس موقع مقام کی بات ہو، خلوص اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کو عقل میں لانے، سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

ہر کلام کا مقصد و منشا ہوتا ہے اور مقصدِ کلام پر آگاہی — الفاظ پڑھنے سے نہیں — مطلب و معنی کو سمجھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ لوگ طب، حساب یا کسی اور علم و فن کی کتاب پڑھتے ہیں تو ان کے مطالب اور ان کی شرح معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب انسانوں کی ساختہ پرداختہ کتابوں سے استفادہ کی یہ صورت ہے، تو اللہ کی کتاب کے مقصد و منشا سے آگاہی

معنی کا علم سیکھے بغیر کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ کتاب جو برائیوں اور گمراہیوں سے ہمارے تحفظ کا ذریعہ ہے، وہ کتاب جو ہمیں صلاحِ دنیا اور فلاحِ آخرت کے آداب سکھاتی ہے وہ کتاب جس پر ہمارے دین کا قیام ہے، وہ کتاب جس پر نجات و سعادت کا مدار ہے۔

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں تفسیری اختلاف بہت کم ہے، نہ ہونے کے برابر۔ تابعین میں ظاہراً تفسیری اختلاف کچھ زیادہ ہے، لیکن وہ بھی بعد والوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ خیر القرون سے قرب جس قدر زیادہ ہے، اسی قدر کلامِ الٰہی کی تفسیر میں اختلاف زیادہ ہے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں: میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تین مرتبہ، اول سے آخر تک، قرآن پڑھ کے سنایا، ٹھہرنے کی ہر آیت پر ٹھہرا، سوال کیے اور مطلب سمجھا۔ اسی لیے امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں: جب تمھیں کسی آیت کی تفسیر، مجاہد سے مل جائے تو کسی اور تفسیر کی جستجو نہ کرو۔ اور اسی لیے امام شافعیؒ و امام بخاریؒ اور دوسرے اہلِ علم نے مجاہد سے مروی تفسیر پر اعتماد کیا ہے، اور امام احمدؒ وغیرہ صاحبِ تفسیر علماء اپنی تفسیروں میں زیادہ تر تفسیرِ مجاہد کی روایت لائے ہیں۔

غرض اس بیان کی یہ ہے کہ تابعین نے جس طرح سنتوں کا علم، اسی طرح قرآن کی تفسیر کا علم صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے حاصل کیا۔ اور جس طرح بعض سنتوں میں استنباط و استدلال کی راہ سے گفتگو کی، اسی طرح بعض تفسیری مقامات میں بھی استنباط و استدلال کی راہ سے گفتگو کی۔

سلف میں، بمقابلۂ احکام، تفسیر میں اختلاف بہت کم ہے۔ تفسیر میں جو اختلاف صحیح طور پر ان سے مروی ہے وہ تعبیر و تنوع کا اختلاف ہے، تضاد کا اختلاف نہیں ہے یہ اختلاف دو قسم کا ہے:

ایک قسم یہ ہے کہ ایک مفسر نے بیان مطلب ایسے الفاظ میں کیا جو دوسرے مفسر کے

الفاظ سے مختلف ہیں اور مطالب کی کسی ایک جہت پر دلالت کرتے ہیں جس پر دوسرے عنصر کے الفاظ دلالت نہیں کرتے، مگر دونوں کی تعبیر کا اصل مرجع ایک ہے۔ اس قسم کے تعبیری اختلاف کی مثال ایسے اسماء کی ہے جن کا مسمّٰی ایک ہو اور مسمّٰی کی مختلف صفات کو ظاہر کرنے کے لیے نام جدا جدا رکھ دیے جائیں۔ جیسے سیف، صارم، مہند ایک ہی مسمّٰی کے نام ہیں جو تلوار کی مختلف صفتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح اسمائے حسنیٰ، اور اسمائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسمائے قرآن ہیں، کہ تمام اسماء کا مسمّٰی ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے اسمائے حسنیٰ میں سے جس نام سے پکارو، پکار کا مرجع اسی کی ذاتِ مقدس ہو گی ؎

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۚ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى - (بنی اسرائیل ۱۱۰) کہہ، پکارو اللہ کو، یا پکارو رحمٰن کو، جس نام سے بھی پکارو، اسی کے لیے ہیں سب نام بہت اچھے

کیوں کہ اس کے اسمائے حسنیٰ سے ہر اسم اس کی ذات اور اس کی کسی خاص صفت پر دلالت کرتا ہے، مثلاً علیم اس کی ذات اور اس کی صفت علم پر دلالت کرتا ہے۔ قدیر اس کی ذات اور اس کی صفتِ قدرت پر، رحیم اس کی ذات اور اس کی صفت رحمت پر۔

جو اصحاب ظواہر اس طرف گئے ہیں کہ اسمائے الٰہی، صفات الٰہی پر دلالت نہیں کرتے، وہ منطقی داؤ پیچ میں آکے باطنیہ اور قرامطہ کے ہم نوا ہو گئے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ اللہ بغیر حیات کے زندہ ہے، اس کو حی نہ کہنا چاہیے اور نہ یہ کہنا چاہیے کہ حی نہیں ہے۔ وہ ذات باری سے نفی نقیضین کرتے ہیں اور گمراہی میں جا پڑتے ہیں۔ اگرچہ باطنیہ اور قرامطہ اسمائے الٰہی کے منکر نہیں ہیں، ان کو مانتے ہیں، لیکن ضمیروں کی طرح ان کو محض علم قرار دیتے ہیں اور اُن صفات کے منکر ہیں جو ان اسماء سے ثابت ہوتی ہیں۔ اصحاب ظواہر، ظاہر معنی سے او عائے تمسک کے ساتھ جب وہی بات کہتے اور مانتے ہیں جو باطنیہ و قرامطہ کا مقالہ ہیں، تو اس باب میں انھی کے ہم مذہب ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ موقع اس مبحث کی تفصیل کا نہیں ہے۔

اصل مقصود یہاں یہ ہے کہ اسمائے الٰہی میں سے ہر اسم اس کی ذات اور اس صفت پر

جو اس سے سمجھی جاتی ہے۔ دلالت کرتا ہے اور بطریق لزوم دوسرے اسم کی صفت پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے محمودہ ہیں: محمد، احمد، ماحی، حاشر، عاقب۔ اور اسی طرح اسمائے مصحف ہیں: قرآن، فرقان، الہدیٰ، الشفا، التبیان، الکتاب۔ اس نوع کی اور بہت سی مثالیں ہو سکتی ہیں۔ اگر پوچھنے والے کا مقصود یہ ہو کہ مسمّٰی متعین کر دیا جائے، تو جواب میں ہم ہر اسم کو استعمال کر سکتے ہیں، اگر پوچھنے والا اس اسم کے مسمّٰی سے واقف ہے۔

اسم کبھی علم ہوتا ہے اور کبھی صفت۔ مثلاً اگر کوئی پوچھے: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ (طٰہٰ ۱۲۴) میں ذکر سے کیا مراد ہے؟ تو ہم جواب دیں گے: ذکر، قرآن ہے، جو کچھ اس میں اتارا گیا، اور ذکر، اللہ کی اتاری ہوئی کتابیں ہیں۔ کیوں کہ ذکر، مصدر ہے، اور مصدر کبھی فاعل کی طرف مضاف کیا جاتا ہے اور کبھی مفعول کی طرف۔ مفعول کی طرف۔ مفعول کی طرف مضاف مانا جائے تو ذکر سے مراد وہ لفظ ہوں گے جن کے ذریعے بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے جیسے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اللہ فاعل کی طرف اضافت مانی جائے تو ذکر سے مراد، خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے ذکر ہوگا۔ اور یہ ذکر اللہ کی کتاب ہے، اور آیۂ مذکورہ میں یہی مراد ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے یہ آیت ہے: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (طٰہٰ ۱۲۳) اور معلوم ہے کہ ہدایت وہی ہے جو ذکر میں اتاری گئی ہے، اس بنا پر کہ اس کے بعد یہ ارشاد ہے: قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا (۱۲۵-۱۲۶)

پس اگر پوچھنے والے کا مقصود یہ جاننا ہے کہ ذکر الٰہی، اللہ کا اتارا ہوا ذکر ہے، یا بندے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا ذکر؟ تو جواب یہ ہے کہ ارشاد باری ہے: میرا ذکر، میری کتاب، میری ہدایت ان سب کا مسمّٰی ایک ہے۔ اور اگر پوچھنے والے کا مقصود، اُس خاص صفت کو جاننا ہو جو اُس اسم کے ساتھ خاص ہے: مثلاً وہ جانتا ہے کہ القدوس، السلام، المومن سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے لیکن وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے القدوس، السلام، المومن ہونے کے کیا معنے ہیں، تو ہمیں تعیین مسمّٰی سے زیادہ، کچھ کہنا ہوگا۔

(باقی)

مطبوعات

حدیث لٹریچر در زبان انگریزی | تالیف: جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب، پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی، قیمت ۱۵ روپے ۔ صفحات ۲۱۱۔

حجیتِ حدیث کے متعلق یوں تو ہمارے اسلاف نے مختلف کتابوں میں بڑا قابلِ قدر ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ لیکن دورِ جدید میں اس کے متعلق جو شکوک و شبہات پھیلائے جا رہے ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کا نئے انداز سے جائزہ لے کر ان کے مسکت جوابات دیئے جائیں۔ اردو زبان میں اس سلسلے میں بعض بزرگوں نے نہایت مفید خدمت سرانجام دی ہے اور بڑے وزنی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سنتِ نبوی پوری طرح محفوظ ہے اور اسے دین میں بطور ایک بنیاد تسلیم کیے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔

انکارِ حدیث کا فتنہ چونکہ مستشرقین کا اٹھایا ہوا ہے اور انگریزی اور اسی طرح کی دوسری مغربی زبانوں کے ذریعہ ہمارے ہاں منتقل ہوا ہے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ اللہ کا کوئی بندہ ان مستشرقین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا انہی کی زبان میں مدلل جوابات دے۔ بمقامِ شکر ہے کہ اس فرض کو ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب نے نہایت عمدہ طریق سے سرانجام دیا ہے۔ وہ کتاب کے آغاز ہی میں اس کا سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس کتاب کی تدوین کی غرض یہ ہے کہ انگریزی دانوں، مسلم اور غیر مسلم دونوں کو حدیث کے آغاز، ارتقاء اور اس کے بارے میں محدثین نے جرح و تعدیل کا جو بیش قیمت ترکہ چھوڑا ہے اس سے روشناس کرایا جائے۔ انگریزی میں اس موضوع پر ایک ہی کتاب موجود ہے یعنی THE TRADITIONS OF ISLAM BY ALFRED GUILAUME, OXORD 1924 لیکن یہ اسلامی نقطۂ نظر کی شارح اور ترجمان نہیں۔ البتہ دوسری یورپی زبانوں میں مثلاً جرمن، فرانسیسی اور ڈچ میں

حدیث کے متعلق کئی ایک عالمانہ اور ناقدانہ کتب شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو ہمارے اسلاف کے صحیح خیالات کی ترجمانی کر سکے "

ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جس مقصد کے تحت انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ آج حدیث پر جس قسم کے حملے کیے جا رہے ہیں اس کے لیے گولہ بارود گولڈزیہر کے تیار کردہ اسلحہ خانہ ہی سے مہیا کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس خدمتِ جلیلہ کے لیے پوری امت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بہت زیادہ اجر عطا فرمائے۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا سستا ایڈیشن تیار کر کے اسے خوب پھیلایا جائے۔

تاریخ تدوین حدیث | تالیف ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب۔ شائع کردہ پاک اکیڈمی کراچی۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔ صفحات ۱۷۶۔

حدیث لٹریچر کے شائع ہو جانے کے بعد فاضل مصنف سے اس بات کا پُر زور مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی تحقیقات کو دوسری زبانوں خصوصاً عربی اور اردو میں بھی منتقل کر کے شائع کریں تاکہ اُن سے لوگ زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ اس مطالبہ کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب نے تاریخِ تدوینِ حدیث کو اردو میں قلمبند فرمایا ہے۔

یہ محققانہ کتاب کراچی یونیورسٹی کے بی اے اور ایم اے کے اسلامیات کے نصاب میں داخل ہے۔

کتاب کا پیش لفظ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے۔ مولانا اس کتاب کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ پچھلے تیس چالیس سال کے دوران میں علماء اسلام نے عامۂ مسلمین کی اس ناواقفیت کو دُور کرنے کے لیے پیہم کوششیں کی ہیں۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے اور جنہیں اتنی

فرصت نہیں ہے کہ علم حدیث کا باقاعدہ مطالعہ کریں، ان کو انکار حدیث کے فتنے سے بچانے کی یہی ایک صورت ہے کہ اُردو زبان میں ایسی مختصر اور عام فہم کتابیں لکھی جائیں جن سے وہ اس علم کی تاریخ معلوم کر سکیں۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی کیمبرج (صدر شعبہ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی) کی یہ کتاب بھی ان مبارک کوششوں میں سے ایک کوشش ہے۔ میں خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ اسے اپنے بندوں کو گمراہی سے بچانے کا ایک مفید ذریعہ بنائے۔"

اسلام کیا ہے (بزبان انگریزی) تالیف: جناب محمد ایوب خاں صاحب۔ شائع کردہ: محمد مسعود الحسن ڈاکخانہ محل مغلاں، ضلع جہلم۔ قیمت ایک روپیہ۔ صفحات ۱۰۸۔

اس کتاب میں مختلف موضوعات، مثلاً اسلام کے معنی، اُس کی ہدایت، دین کا مقصد و مدعا، اسلامی اعتقادات، اور اسلامی نظام زندگی پر قرآن مجید کی آیات کو جمع کر کے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے مصنف منکرین حدیث کے نقطۂ نظر کے ترجمان تو معلوم نہیں ہوتے لیکن اُن کی بعض تصریحات ایسی ہیں جو کافی حد تک نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔ ہم یہاں صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کا یہ کہنا کہ "اللہ کا دین درحقیقت اُن بنیادی اور ابدی قوانین کا نام ہے جو انسان کے جسم میں ودیعت ہیں، اور اسی طرح اس کے طرزِ عمل کو متعین کرتے ہیں" کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ یہ نقطۂ نظر بنیادی طور پر غلط ہے۔ سائنس کی ہوشربا ترقی کی وجہ سے نظامِ فطرت کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اُس کی بنا پر لوگوں کے ذہن میں یہ باطل خیال پرورش پانے لگا ہے کہ دین دراصل نظامِ فطرت کا دوسرا نام ہے۔ انفس و آفاق کے بارے میں صحیح غور و فکر ہمیں خالقِ کائنات کے وجود کا تو پتہ دیتا ہے لیکن اس کی مدد سے ہم زندگی کے ان گوشوں کی نقاب کشائی نہیں کر سکتے جن کے متعلق ہمیں وحی و الہام نے رہنمائی دی ہے۔ انسان ہر حال میں مشکوٰۃ نبوت کا محتاج ہے۔

اس طرح یہ کہنا کہ انسان کا مقصد صرف تسخیر کائنات ہے صحیح نہیں۔ پھر فاضل مصنف کا یہ ارشاد کہ اسلام نے زنا کے لیے ۱۰۰ کوڑوں کی سزا مقرر کی ہے، غیر شادی شدہ کے متعلق تو صحیح ہے لیکن

شادی شدہ زانیوں کے لیے اللہ کے رسول نے سنگسار کی سزا مقرر فرمائی ہے۔ اس نوعیت کی اور بہت سی باتیں کتاب میں موجود ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے حدیث سے یکسر صرفِ نظر کر کے اسلام کے مقصد و مدعا کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

شعر العرب جلد اوّل | ترجمہ: جناب پروفیسر عبد الصمد صارم الازہری۔ جلد اوّل۔ شائع کردہ: ادارہ علمیہ ۵ دھنی رام روڈ، نئی انار کلی لاہور۔ قیمت آٹھ روپے۔

زیر تبصرہ تصنیف ابن قُتَیبہ کی مشہور کتاب الشعر والشعراء کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں امرءُ القیس سے لیکر ابو نواس و اشجع السُلمی تک کے نہ صرف حالات قلمبند ہیں بلکہ اُن کے منتخب اشعار بھی درج ہیں۔ ان اشعار کے مطالعہ سے ہم صرف عربی شاعری ہی سے آشنا نہیں ہوتے بلکہ عربوں کی ذہنی ساخت، اُن کے طرزِ فکر، اُن کی تہذیب و تمدن اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کے متعلق بھی ہمیں بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں خصوصاً اسلام سے قبل اُن کے حالات کا ہمیں ان اشعار کے ذریعہ صحیح پتہ چلتا ہے۔ کتاب کا ترجمہ ایک مستند عالم اور عربی کے ممتاز معلّم نے کیا ہے۔ اس بنا پر قابلِ اعتماد ہے۔ جو حضرات عربی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں، یا عربوں کا ذوقِ شاعری جاننے کے خواہشمند ہیں وہ اس کتاب سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

معرکۂ دین و سیاست | از جناب ابو السلام نعیم صدیقی صاحب۔ شائع کردہ: دار الاشاعت مصنفین لاہور۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ ستیارہ۔ اچھرہ لاہور۔

پوری تاریخِ انسانی حق و باطل کی ایک مسلسل آویزش ہے۔ اس کشمکش کے مطالعہ سے ایک بات جو اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ چند نفوسِ قدسی کو چھوڑ کر اصحابِ اقتدار نے بالعموم باطل قوتوں کا ساتھ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جن کے تغیرات کا مطالبہ کرتا ہے اُن کے قبول کرنے میں اُن کی عیش پسند طبیعتیں آمادہ نہیں ہوتیں پھر ہمیں تاریخ سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ غلط اقتدار دین کی قوتوں سے ہمیشہ لرزہ براندام رہا ہے اور اس نے اس امر کی پوری کوشش کی کہ اس کے دائرہ کو صرف مذہبی زندگی تک محدود کر دیا جائے اور سیاست و معاشرت اس کے اثر سے آزاد رہیں۔ نعیم صاحب نے اس کتاب میں عباسی دور کے معرکۂ دین و سیاست کو نہایت اچھوتے انداز میں قلمبند کیا ہے۔

(بقیہ اشارات)

اور دشمنی سب اُسی ہستی کے تابع ہو۔ اس داعیہ کو جو انسان کا سب سے زبردست داعیہ ہے، مذہب کہا جاتا ہے۔ جس طرح انسان کو دوسرے داعیات سے کسی طرح مفر نہیں اور وہ انہیں ہر حال میں پورا کرنے پر مجبور ہے اور اگر جائز طریقوں سے پورا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تو وہ قوت کے بل پر پست تر صورتوں میں اپنا حق پوری طرح وصول کر لیتے ہیں، بالکل اسی طرح انسان کے مذہبی حاسے کی اگر فطری انداز سے تسکین نہ ہو تو وہ دوسری صورتیں پیدا کر لیتا ہے۔

محدود، لامحدود سے، ناقص، کامل و اکمل سے، فانی، لافانی سے، محتاج غنی مطلق سے فطری طور پر رشتہ عبودیت استوار کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اس کے لیے کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ اس کی اپنی زندگی کا سارا دارومدار اسی پر ہے۔ اس آرزو کی صحیح صورت یہ ہے کہ انسان یہ رشتہ اُسی بلند و بالا ذات اور اُسی قادرِ مطلق ہستی سے استوار کرے جو کائنات کی واحد خالق، مالک اور فرمانروا ہے اور جس کے سامنے کائنات کا ہر ذرہ تکوینی طور پر سرِ تسلیم خم کر رہا ہے۔ انسان اگر اپنے مقام کو اور اپنے معبودِ حقیقی کے مقام کو صحیح طور پر پہچان کر پورے شعور و احساس کے ساتھ اُس سے رشتہ عبودیت قائم کر لیتا ہے تو وہ دراصل اپنے مقصدِ تخلیق کو صحیح معنوں میں پورا کرتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو پوری کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے وہ اس راہ میں بھٹک جاتا ہے اور کائنات کے بدیہی حقائق کے باوجود وہ اپنے مالکِ حقیقی کی معرفت سے محروم رہتا ہے، تو اس سے اُس کا جذبہ عبودیت ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی تسکین کے لیے کچھ غلط صورتیں نکال لیتا ہے۔ اصنام پرستی، اشجار پرستی، قبر پرستی، ملوک پرستی، ارواح پرستی اور نجوم پرستی اسی جذبہ عبودیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ دورِ جدید میں یہی جذبہ قوم پرستی اور وطن پرستی کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ آج کا انسان اپنے وطن کی خاک سے عقیدت و محبت کے وہی جذبات رکھتا ہے جو ایک عبد کو اپنے معبودِ حقیقی سے رکھنے چاہییں۔ انہیں دیکھ کر انسان اس امر کا بخوبی اندازہ

لگا سکتا ہے کہ اس جذبۂ عبودیت کی جڑیں انسانی فطرت میں کس قدر گہری ہیں اور انسان اپنے صنعتی کمالات اور سائنسی ایجادات کے باوجود انہیں اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی روشن خیالی اور مذہب بیزاری نے بھی اس سلسلہ میں اُس کی کوئی معاونت اور دستگیری نہیں کی اور آج بھی وہ اس بات پر مجبور ہے کہ کسی ذات کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کرے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی مذہب سے بے تعلقی بلکہ نفرت اور دشمنی کوئی ایسی چیز نہیں جس کے متعلق دو رائیں ہوں۔ اُن کی بے شمار تقریریں اور تحریریں ان کے مذہب بیزار طرزِ فکر پر گواہ ہیں۔ جب کبھی بھی اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے بڑے تحقیر آمیز لہجے میں اس پر رائے زنی کی لیکن مذہب کے ساتھ اس عداوت کے باوجود وہ اپنے آپ کو مذہبی احساسات سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ وہ بے جانے بوجھے ہمیشہ اسی کی گرفت میں رہے اور موت کے بعد بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ البتہ ان کے اندر حاسۂ مذہبی نے خالق کی پرستش کی بجائے وطن پرستی کی شکل اختیار کی اور خاکِ ہند کے ساتھ انہوں نے محبت و عقیدت کے وہی رشتے استوار کیے جو ایک مذہبی انسان اپنے خالق کے ساتھ کرتا ہے۔ انہوں نے بھارت کو اپنا معبود بنایا، زندگی بھر اس زمین کے ٹکڑے کی خاطر زبردست قربانیاں کیں۔ ناز و نعمت کی زندگی چھوڑی، اپنے آرام و آسائش کو قربان کیا۔ مال و متاع سے کنارہ کشی اختیار کی۔ پولیس کی لاٹھیاں کھائیں۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ اپنے مخلص دوستوں اور رفیقوں سے اس کی خاطر جدائی مول لی۔ اور بالآخر اسی کی خدمت اور چاکری میں اپنی صحت و توانائی تک کی بھی پروا نہ کی اور بڑی خوشی کے ساتھ جان جاں آفریں کے حوالے کر دی۔ پھر اپنی زندگی میں اس امر کا بھی اہتمام کر لیا کہ اُن کے جسم کی راکھ کو کھیتوں میں ڈال دیا جائے تاکہ جسم کے ذرے آخر کار وطن ہی پر نچھاور ہو کر سرزمینِ ہند میں جذب ہو جائیں۔

کیا یہ عقیدت و فریفتگی، یہ اخلاص اور جاں نثاری، حاسۂ مذہبی کی علمبرداری اور فرمانروائی کی آئینہ دار نہیں ؟

ضروری اعلان

(۱) منصب رسالت نمبر کی چند کاپیاں دفتر "ترجمان القرآن" میں بچی ہوئی ہیں۔ قیمت فی کاپی (۵۰/۳) ہے۔ مگر اب فی کاپی (۲ روپے مع ڈاک خرچ) کے حساب سے جو اصحاب چاہیں خرید سکتے ہیں۔

(۲) "ترجمان القرآن" کے پرانے پرچے از جون ۱۹۴۸ء تا اکتوبر ۱۹۶۳ء دفتر میں غیر مسلسل موجود ہیں۔ ۲ آنے فی کاپی کے حساب سے جن اصحاب کو ضرورت ہو، منگوا سکتے ہیں۔

مینیجر "ترجمان القرآن"
اچھرہ۔ لاہور

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

اسلامی معاشرت پر مستند اور جامع کتب

پردہ

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

- سوسائٹی میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟
- ایک صالح معاشرہ کی تعمیر میں پردہ کی اہمیت۔
- مغرب میں ترک پردہ سے پیدا شدہ مسائل اور نقصانات۔
- عورت اور مرد کے دائرۂ کار کا تعین، ہر خاندان کی ایک ضرورت۔

قیمت قسم اعلیٰ ۵/۵۰ روپے سستا ایڈیشن ۳/۵۰ روپے

عورت اسلامی معاشرہ میں

از: مولانا سید جلال الدین انصر عمری

- اسلام کے نظام معاشرہ کی مکمل تصویر
- اسلام اور دوسری تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ
- اسلام میں عورت کا صحیح مقام اور دائرہ کار

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۶ روپے سستا ایڈیشن ۵۰،۲ روپے

اسلام اور ضبطِ ولادت

(نظرثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن)

- تحریک ضبطِ ولادت کا تاریخی و سیاسی پس منظر
- اس کے اخلاقی، تمدنی اور معاشی اثرات کا جائزہ
- مذہبی اور دینی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت

آفسٹ کی نفیس طباعت۔ قیمت صرف ۲ روپے

حقوق الزوجین

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اسلامی قانون ازدواج پر ایک مستند کتاب جس کی سند عدالتوں میں مانی جاتی ہے۔
- غیر مسلموں کے قوانینِ ازدواج اور اسلامی قوانین کا تقابلی مطالعہ
- پرسکون خاندانی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک ناگزیر کتاب

آفسٹ کی حسین طباعت۔ قیمت ۲/۲۵ روپے

سورۃ الاحزاب

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

- غزوۂ احزاب کا تاریخی پس منظر۔
- مسئلہ ختم نبوت پر مفصل بحث۔
- نکاح و طلاق اور پردہ کے ابتدائی احکام

آفسٹ کی حسین طباعت۔ ہدیہ صرف ساڑھے چار روپے

آپ کیا کریں؟

از: مولانا عبدالحی

- دنیا کی موجودہ مشکلات اور ان کا حل۔
- اسلام کی دعوت اور اس کے عملی تقاضے
- خواتین کے لیے اصلاح کا عملی پروگرام

خوبصورت ٹائٹل۔ قیمت صرف ۱/۴۰ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکٹ لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰